اسلامی مرکز کا ترجمان

الرسالہ

جنوری ۱۹۸۴
شمارہ ۸۶

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

تعارفی سٹ

اسلام کے تعارف پر ہم نے پانچ کتابوں کا ایک سٹ تیار کیا ہے جو مدارس میں ابتدائی اسلامی تعلیم کے لئے بھی مفید ہے اور اسلام کے عمومی تعارف کے لئے بھی۔ یہ سٹ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سچا راستہ	دو روپیہ
۲۔ دینی تعلیم	تین روپیہ
۳۔ حیات طیبہ	تین روپیہ
۴۔ باغ جنت	تین روپیہ
۵۔ نار جہنم	تین روپیہ

اس تعارفی سٹ کو اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں شائع کرنے کے لئے جو لوگ کوئی تعاون کریں وہ انشاء اللہ خدا کے یہاں اس کا اجر پائیں گے۔

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

زر تعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

ایک پکار

رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ نے مکہ کے باشندوں کو صفا پہاڑی کے پاس جمع کیا اور فرمایا کہ اے لوگو، جس طرح تم سوتے ہو اسی طرح تم مروگے۔ اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح تم دوبارہ اٹھائے جاؤگے۔ اس کے بعد یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم یہ سن کر ابولہب نے کہا، تمہارا برا ہو، کیا تم نے ہم کو اسی لئے بلایا تھا (تبا لك ، اما جمعتنا الا لهذا)

رسول اللہ صلّے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ کے سردار بن کر مدینہ میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی آپ نے اسی قسم کی تقریر فرمائی۔ اس وقت بھی آپ کے پاس کہنے کی جو سب سے بڑی بات تھی وہ یہ تھی کہ اے لوگو اپنے آپ کو آگ کے عذاب سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو (اتقوا النار ولو بشق تمرۃ)

اسلامی مرکز کا مقصد اسی پیغمبرانہ دعوت کو زندہ کرنا ہے۔ لوگ مسائل زندگی کے لئے اٹھتے ہیں۔ ہم مسائل موت کے لئے اٹھے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو اس مشن میں ہمارا ساتھ دے۔ لوگوں کو جنگ اور فساد کے شعلے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا کوئی ہے جس کو جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دیتے ہوں تاکہ وہ ہمارا ساتھ دے کر دنیا والوں کو جہنم کے شعلوں سے ڈرائے۔

لوگوں کو شہروں کی رونقیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم ان انسانوں کی تلاش میں نکلے ہیں جن کو قبرستان کے ویرانے دکھائی دیں۔ ایسے انسانوں سے دنیا پٹی ہوئی ہے جن کو یہ محرومی بیتاب کئے ہوئے ہے کہ ان کو کسی ادارہ میں داخلہ نہیں ملا۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کو یہ غم بدحواس کر دے کہ کہیں وہ جنت کے داخلہ سے محروم نہ ہو جائیں۔ لوگ دنیا کی بربادی کا ماتم کر رہے ہیں۔ ہم ان انسانوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو آخرت کی بربادی کے اندیشے میں دیوانے ہو چکے ہوں۔

خدا کی دنیا میں آج سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر وہی ایک کام نہیں ہو رہا ہے جو خدا کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ یعنی آنے والے ہولناک دن سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ اگر انسان اس پکار کے لئے نہ اٹھیں تو اسرافیل کا صور اسے پکارے گا۔ مگر آہ، وہ وقت جاگنے کا نہیں ہوگا۔ وہ ہلاکت کا اعلان ہوگا نہ کہ آگاہی کا الارم۔

آغازِ عمل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مکہ سے نکلے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:
ما اطیبك من بلد و احبك الیّ۔ ولولا ان قومی اخرجونی منك ما سکنت غیرك (اے مکہ تو میرے نزدیک کتنا اچھا شہر ہے اور کتنا محبوب ہے۔ اور اگر تیری قوم مجھ کو تیرے یہاں سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کہیں نہ رہتا، ترمذی)

پیغمبر نے اپنے محبوب وطن سے محرومی کو گوارا کیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مدینہ میں اسلام کا زبردست مرکز قائم ہو گیا۔ اگر وہ مکہ سے ہجرت کرنے کے بجائے مکہ والوں سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتے تو اسلام کی تاریخ بننے سے قبل پہلے ہی قدم پر ختم ہو جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی عقلمندی محرومی پر راضی ہونا ہے اور سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ آدمی اپنی محرومی پر راضی نہ ہو ——— یہی ایک لفظ میں دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا راز ہے اور یہی آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا راز بھی۔

محرومی پر راضی ہونا دوسرے لفظوں میں حقیقت واقعہ کا اعتراف کرنا ہے۔ جب آدمی حقیقت واقعہ کا اعتراف کرتا ہے تو وہ اپنی جدوجہد کے آغاز کو پالیتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ حقیقت واقعہ کا اعتراف نہ کرے تو وہ ایسی چیزوں کے حصول کے لئے دوڑتا رہے گا جو اس کو ملنے والی نہیں۔

اس بات کو سن کر نادان لوگ ہمیشہ بول اٹھتے ہیں ——— اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یا قوم آج محروم ہے وہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو محروم بنالے۔ اس قسم کا خیال زندگی سے سراسر ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ زندگی ایک نمو پذیر حقیقت ہے۔ زندگی میں ٹھہراؤ ممکن نہیں۔ جب آپ اپنے کو اس واقعی مقام پر رکھنے پر راضی ہوتے ہیں جہاں باعتبار حالات آپ کو ہونا چاہئے تو گویا آپ اپنے کو وہاں رکھتے ہیں جہاں آپ کی زندگی نمو پذیری کی صلاحیت کو بروئے کار لا سکتی ہے۔ جہاں سے آپ اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھ سکتے ہیں۔ محرومی پر راضی ہونے والا اپنے آغاز کو پالیتا ہے، اور اپنے آغاز عمل کو پالینا ہی منزل پر پہنچنے کا سب سے بڑا راز ہے۔

کسی مفکر کا قول ہے "سیاست ممکنات کا کھیل ہے"، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آج ممکن ہے اس سے آغاز کر کے آپ وہاں پہنچ سکتے ہیں جو آج آپ کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ آج ہی سے ناممکن سے آغاز کریں تو سفر کا آغاز ہی نہ ہوگا۔ آپ ممکن سے بھی محروم رہیں گے اور ناممکن سے بھی۔

سب سے زیادہ، سب سے کم

سردی کے موسم میں سانپ ٹھٹھرا پڑا ہوا ہے۔ بظاہر وہ ایک کالی رسی کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب آپ اس کو چھوتے ہیں تو اچانک وہ پھن نکال کر کھڑا ہو جاتا ہے۔۔ یہی ہر آدمی کا حال ہے۔ ہر آدمی بظاہر اچھا آدمی ہے۔ مگر جب اس کو چھیڑئیے تو اچانک وہ ایسا بن جائے گا جیسے اس کے اندر برائی کے سوا اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔

ایک شخص دیکھنے میں بالکل ٹھیک معلوم ہوگا۔ عام تعلقات میں وہ دیندار اور با اخلاق نظر آئے گا۔ لیکن اگر اس کو آپ سے کوئی شکایت ہو جائے، آپ سے اس کو کوئی ٹھیس پہنچ جائے تو وہ اگلے ہی لمحہ آپ کے لئے دوسرا انسان بن جائے گا۔ اب ایسا معلوم گویا اس کو دین اور اخلاق سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

ایک شخص اچھی اچھی باتیں کرے گا۔ وہ سچائی کا طالب دکھائی دے گا۔ لیکن اگر آپ اس پر تنقید کر دیجئے۔ آپ ایسی بات کہہ دیجئے جس کی زد اس کی ذات پر پڑتی ہو تو وہ فوراً بپھر اٹھے گا۔ ایسا نظر آئے گا گویا اس کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں کہ سنجیدگی کے ساتھ کسی مسئلہ کو سمجھ سکے۔

ایک شخص ہے جس کی نظر میں آپ طاقتور ہیں۔ آپ کے اندر وہ دنیوی اہمیت کی چیز دیکھتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ آپ کا زبردست قدرداں ہوگا۔ آپ اس کو عظیم انسان نظر آئیں گے۔ اور اگر آپ اس کی نگاہ میں کمزور ہوں آپ سے اس کو کوئی فائدہ نہ ہو تو اس کی نظر میں آپ بے قیمت ہوں گے۔ آپ کا اخلاص اس کو بے وقوفی دکھائے گا۔ آپ کی اچھی بات بھی اس کو بے وقعت معلوم ہونے لگے گی۔

ایک شخص ہے جس سے ابھی آپ کا کوئی معاملہ نہیں پڑا۔ اس سے آپ کے دور دور کے تعلقات ہیں ایسی حالت میں وہ بالکل صحیح بنا رہے گا۔ لیکن اگر اس سے کوئی معاملہ پیش آجائے۔ آپ کے کسی عمل سے اس کا مفاد مجروح ہو جائے تو اس کے بعد وہ ایسا بن جائے گا جیسے وہ بظاہر انسان مگر بباطن حیوان تھا۔ اب وہ آپ کے سامنے ایک بالکل مختلف انسان کے روپ میں ظاہر ہوگا۔ وہ ایک ایسا شخص بن جائے گا جو غصہ اور انتقام کے سوا کچھ اور جانتا ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خود پرست انسان دنیا میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں، اور خدا پرست انسان دنیا میں سب سے زیادہ کم۔

محنت کے ذریعہ

جوزف کانریڈ (Joseph Conrad) پولینڈ کے ایک شہر برڈک زیو (Berdiczew) میں ۱۸۵۷ میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی میں یتیم ہوگیا۔ اپنی زندگی کے ابتدائی زمانہ میں اس کو ملاحی کے ذریعہ اپنی معاش فراہم کرنی پڑی۔ اس کی باقاعدہ تعلیم بھی نہ ہوسکی۔ مختلف ملکوں میں سفر کرتا ہوا بالآخر وہ انگلستان پہنچا۔ اور ۱۸۸۶ میں اس نے برطانوی شہریت حاصل کرلی۔

برطانیہ کے زمانۂ قیام میں اس نے انگریزی سیکھنے کے لئے غیر معمولی محنت کی۔ یہاں تک وہ انگریزی زبان کا مستند ادیب بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانہ میں انگلستان کے زندہ مصنفین میں اس کی شہرت ہارڈی (Hardy) کے بعد صرف نمبر ۲ پر تھی۔

اس کی کتاب لارڈ جم (Lord Jim) میں اس کے جو حالات چھپے ہیں اس میں اس کے بارے میں یہ جملہ درج ہے "اس نے انگریزی زبان میں صاحب طرز ادیب کا نام حاصل کیا اگرچہ ۱۹ سال کی عمر تک اس کا یہ حال تھا کہ وہ انگریزی کا ایک لفظ نہ بول سکتا تھا:

He made his name as a stylist in English although he was unable to speak a word of the language before he was nineteen.

جوزف کانریڈ کی دو درجن سے اوپر کتابیں ہیں جو زیادہ تر ناول یا کہانی کے پیرایہ میں ہیں۔ انگریزی اگرچہ اس کی مادری زبان نہ تھی مگر اس کی انگریزی کتابیں یونی ورسٹیوں کے تعلیمی نصاب میں شامل ہیں۔ اس نے ۱۹۲۴ میں انگلستان میں وفات پائی۔

انگلستان کے ایک باشندہ نے مجھ سے بتایا کہ کالج میں اس کے انگریز استاد نے ایک بار اس سے کہا کہ تم جوزف کانریڈ کو پڑھو۔ وہ بہت خوب صورت انگریزی لکھتا ہے:

Read Joseph Conrad. He writes beutiful English

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محنت ہر چیز کا بدل ہے۔ آپ غریب گھر میں پیدا ہوکر بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ بن سکتے ہیں۔ آپ غیر اہل زبان ہوکر اہل زبان جیسے ادیب بن سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کی نظر میں غیر اہم ہوتے ہوئے ایسی چیز لکھ سکتے ہیں جس کو پڑھنے کے لئے تمام دنیا والے مجبور ہوں۔

جب حقیقت کھلے گی

دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ دکھاوے کے لئے خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال آخرت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہاں جب کہا جائے گا کہ اپنے رب کو سجدہ کرو تو وہ وہاں سجدہ نہ کر سکیں گے (قرآن ۶۸ - ۴۲)

سجدہ محض ایک وقتی اور رسمی نوعیت کا جسمانی فعل نہیں۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ کے آگے جھکانا ہے، وہ اپنی پوری زندگی کو حق و صداقت کے تابع بنا دینا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں محدود معنوں میں صرف "سجدہ" کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ آیت پوری زندگی کے بارہ میں ایک اہم حقیقت کو بتا رہی ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم کا یہ حال ہے کہ ان کے دل سچائی کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو حق کے تابع نہیں بنایا ہے۔ مگر ظاہری رویہ میں ہر ایک یہ دکھا رہا ہے کہ وہ حق پر قائم ہے۔ ہر ایک اپنی زبان سے ایسے الفاظ بول رہا ہے گویا کہ اس کا کیس انصاف کا کیس ہے نہ کہ ظلم اور استغلال کا کیس۔

مگر اس قسم کی دھاندلی صرف موجودہ امتحانی دنیا میں ممکن ہے۔ آخرت کے آتے ہی پوری صورت حال بالکل بدل جائے گی۔ بازار میں کھوٹے سکے چل سکتے ہیں مگر بنک میں کھوٹے سکے نہیں چلتے۔ اسی طرح آخرت میں اس کا امکان ختم ہو جائے گا کہ کوئی جھوٹی بات کو سچے الفاظ میں بیان کرے۔ کوئی بے انصافی کے عمل کو انصاف کا عمل ثابت کرے۔

آخرت میں یہ ہوگا کہ الفاظ جھوٹے معانی کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ ظلم کو انصاف بتائے اور باطل کو حق کے لباس میں پیش کرے۔ اس وقت ظاہر اور باطن کا فرق ختم ہو جائے گا۔ آدمی کی زبان وہی بول سکے گی جو اس کے دل میں ہے۔ اس دن ہر آدمی عین اس روپ میں دکھائی دے گا جو باعتبار حقیقت تھا نہ کہ اس روپ میں جو وہ مصنوعی طور پر دوسروں کے سامنے ظاہر کر رہا تھا۔

لوگ انسان کے سامنے اپنے آپ کو حق بجانب دکھا کر مطمئن ہیں کہ وہ حق بجانب ثابت ہو گئے۔ حالانکہ حق بجانب وہ ہے جو خدا کے سامنے حق بجانب ثابت ہو۔ اور وہاں کا حال یہ ہے کہ وہاں صرف حق حق ثابت ہوگا اور جو باطل ہے وہ وہاں صرف باطل ہو کر رہ جائے گا۔

ہمارا المیہ

نیوٹن ایک عیسائی خاندان میں پیدا ہوا۔ وہ پورے معنوں میں ایک مذہبی آدمی تھا۔ حتیٰ کہ وہ چرچ بھی جاتا تھا۔ مگر دنیا کے سامنے وہ ایک سائنس داں کی حیثیت سے آیا نہ کہ ایک مذہبی انسان کی حیثیت سے شمسی نظام کے بارہ میں اس نے جو تحقیقات کیں انھیں کو مدون کرنے میں اس نے اپنی ساری عمر لگا دی اور اسی حیثیت سے وہ دنیا کے سامنے متعارف ہوا۔

یہی اکثر سائنس دانوں کا حال ہے۔ موجودہ زمانہ میں مغربی ملکوں میں جو بڑے بڑے علمائے سائنس اٹھے ان کی اکثریت اپنی ذاتی زندگی میں مذہبی تھی۔ وہ زیادہ تر عیسائی یا یہودی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے حالات بتاتے ہیں کہ اپنے پیدائشی مذہب سے ان کا تعلق آخر وقت تک کسی نہ کسی طرح باقی تھا۔

مگر یہ سائنس داں دنیا کے سامنے جو چیز لے کر ابھرے وہ ان کا آبائی مذہب نہ تھا بلکہ سائنس تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی سائنسی تحقیقات میں گذار دی اور انھیں تحقیقات کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے پرجوش طور پر کام کرتے رہے۔

اس فرق کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذہب ان کے لئے ایک آبائی وراثت تھی جب کہ سائنس ان کے لئے ایک دریافت کی حیثیت رکھتی تھی۔ آبائی وراثت کے معاملہ میں آدمی کبھی پرجوش نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس جو چیز اسے بطور دریافت ملتی ہے وہ اس کی سب سے بڑی چیز ہوتی ہے وہ اس کے بغیر رہ نہیں سکتا کہ دنیا کے سامنے اسے پیش کرے۔

یہ ایک خارجی مثال ہے جس میں خود ملت اسلام کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر کثرت سے بڑے بڑے لیڈر پیدا ہوئے۔ انھوں نے بڑے بڑے کام بھی کئے۔ مگر ان میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے اقوام عالم کے سامنے اسلام کا پیغام پہنچانے کو کام سمجھا ہو اور اسی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہو۔

اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اسلام ان کو بطور وراثت ملا تھا نہ کہ بطور دریافت۔ اگر اسلام ان کی "دریافت" ہوتا تو انھیں اس کے بغیر چین نہ آتا کہ وہ اس کو سارے عالم تک پہنچا دیں۔ وہ اسی کے لئے جیتے اور اسی کے لئے مرتے۔ دنیا والوں سے کہنے کے لئے ان کے پاس سب سے بڑی بات یہی ہوتی۔ مگر جو اسلام بطور قومی وراثت ملا ہو وہ کبھی آدمی کے اندر اس قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔

اسراف کا نتیجہ

مصر کا حکمراں خدیو اسماعیل پاشا (۱۸۹۵ - ۱۸۳۰) اعلےٰ صلاحیت کا مالک تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ مصر کو عملی طور پر ترکی کی عثمانی خلافت سے آزاد کرلیا۔ بحر احمر اور بحر روم کو ملانے کے لئے نہر سوئز نکالنے کا منصوبہ (۱۸۶۶) اسی کے زمانہ میں بنا۔ اسماعیل پاشا نے اس منصوبہ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کو فوراً منظوری دے دی۔

خدیو اسماعیل پاشا عوام کو خوش کرنا بھی جانتا تھا۔ چنانچہ وہ مصر کا پہلا حکمراں ہے جس نے ملک میں ۱۸۶۷ میں منتخب اسمبلی کے طریقہ کو رائج کیا۔ اس کی زندگی میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو اس کی اعلیٰ صلاحیت کو ثابت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود خدیو اسماعیل پاشا کا آخری انجام یہ ہوا کہ وہ نالائق حکمراں قرار پایا۔ اور اپنے بیٹے توفیق پاشا کے حق میں اس کو تخت و تاج چھوڑنا پڑا۔

اس ناکامی کی وجہ خدیو اسماعیل پاشا کی ایک غلطی تھی۔ اور وہ اس کا حد سے بڑھا ہوا اسراف تھا۔ مصر میں وہ ایک فضول خرچ حکمراں کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ مصر سے باہر (ترکی فرانس وغیرہ) جاتا تو وہاں وہ اور بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ دولت خرچ کرتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانہ میں مصر کے قرضہ کی مقدار ۱۰۰ ملین پونڈ تک پہنچ گئی تھی۔

خدیو اسماعیل پاشا کی فضول خرچیوں کو پورا کرنے کے لئے مصر کا خزانہ ناکافی تھا۔ چنانچہ اس نے ملک کے بیت المال، خیراتی اوقاف اور یتیموں اور بیواؤں کے فنڈ سے بھی قرض لے رکھا تھا جو تقریباً ۵۴۷،۰۰۰ پونڈ کے برابر تھا۔

ان قرضوں کی ادائیگی کے لئے اس نے مصری عوام کے اوپر ٹیکسوں کا بوجھ لاد دیا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اس کے زمانہ میں تقریباً چالیس قسم کے ٹیکس ملک میں نافذ تھے۔ عبدالرحمٰن الرافعی کی کتاب "اسماعیل" اور یوسف نحاس کی کتاب "الفلاح" میں اس کے ٹیکسوں کی جو تفصیل درج ہے وہ انتہائی دہشت ناک ہے۔ مثلاً قدیم مصری کسان ایک لباس پہنتے تھے جس کو زعبوط کہا جاتا تھا۔ اسماعیل پاشا کی حکومت نے اس کپڑے پر بھی ٹیکس لگا دیا۔

ایک زعبوط پر ایک ریال ٹیکس تھا۔ ادائیگی کے وقت زعبوط کی آستین پر ایک خاص قسم کی مہر ڈال دی جاتی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ اس کا ٹیکس ادا ہو چکا ہے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ یہ مہر پانی لگنے سے

چھوٹ جاتی تھی۔ اس لئے کسان اپنے زعبو ا کو دھوتے ہوئے اس کے مہر کے حصہ کو چھوڑ دیتا۔ کیوں کہ معلوم تھا کہ ٹیکس وصول کرنے والے جو ہر وقت بازاروں میں گھومتے رہتے تھے مہر کا نشان ملتے ہی اس کے اوپر دوسرا ریال لگادیں گے۔ ٹیکسوں کی اس کثرت کے باوجود یہ حال تھا کہ دو سال تک سرکاری ملازموں اور فوجیوں کی تنخواہیں نہ دی جاسکیں۔

مگر قرض کی ادائیگی کے لئے یہ سارے ٹیکس بھی ناکافی ثابت ہوئے۔ کیوں کہ اسماعیل پاشا کا اسراف بھی اسی کے ساتھ برابر جاری تھا۔ آخر وہ اندوہناک واقعہ ہوا جس نے مصر کی تاریخ بدل ڈالی۔ اسماعیل پاشا نے قرضوں کی ادائگی کے لئے نہر سویز میں حکومت مصر کے حصہ کو ۱۸۷۹ میں انگلستان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ جب اس سے بھی قرضوں کا بوجھ ختم نہ ہوا تو اس نے فرانس کے قرضوں کے معاوضہ میں فرانس کو انگلستان کے ساتھ سویز میں شریک قرار دے دیا۔ اور سویز کے اوپر جہاں پہلے انگلستان اور مصر کا کنٹرول تھا، اب فرانس اور انگلستان کا کنٹرول قائم ہو گیا۔ اور اسی کے ساتھ مصر میں ان کی سیاست کے داخلہ کا دروازہ بھی کھل گیا۔

جمال عبدالناصر کا ۱۹۵۶ میں سویز کو نیشنلائز کرنا گویا اسماعیل پاشا کی اسی غلطی کی اصلاح تھا۔ مگر صدر ناصر نے یہ دوسری غلطی کی کہ اسراف کی اصلاح ناعاقبت اندیشانہ اقدام سے کرنی چاہی جو مصر کے حق میں پہلے سے بھی زیادہ مہنگی ثابت ہوئی۔

زندگی خواہ افراد کی ہو یا قوموں کی، نہایت نازک امتحان ہے۔ یہاں ہر ایک کے حوصلہ اور ہوشمندی کی جانچ ہو رہی ہے۔ ہمیں ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔ کیونکہ کوئی ایک غلطی بھی اتنی فیصلہ کن ہو سکتی ہے کہ ہماری ساری امیدوں پر پانی پھیر دے اور ہمارے لئے بالآخر حسرت کے سوا اور کچھ نہ چھوڑے۔

اعلان

حیدر آباد میں اسلامی مرکز کی باقاعدہ شاخ قائم ہو گئی ہے۔ وہاں کا پتہ حسب ذیل ہے:

مرکز اسلامی حیدر آباد ۳-۶-۳۷۳/اے حمایت نگر، حیدر آباد ۵۰۰۰۲۹

Islamic Centre, 3-6-373/A, Himayatnagar, Hyderabad 500029

Telephone : 66812

روحانی کثافت

مشینی صنعت نے موجودہ زمانہ میں انسان کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کیا ہے جس کو کثافت (Pollution) کہا جاتا ہے۔ مشینوں اور کارخانوں کی وجہ سے شور میں اضافہ ہوا ہے جس کو (Noise Pollution) کہتے ہیں۔ اسی طرح پانی اور ہوا میں گندگی شامل ہو رہی ہے جس کو (Water Pollution) اور (Air Pollution) کہا جاتا ہے۔

کمیونسٹ ملکوں میں اب ایک نئی اصطلاح وضع ہوئی ہے جس کو روحانی کثافت (Spiritul Pollution) کا نام دیا گیا ہے۔ اس اصطلاح کا آغاز کمیونسٹ چین سے ہوا ہے، سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن کے زمانہ میں امریکہ اور چین کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کے تحت چین اور مغربی دنیا کے درمیان آمد و رفت بڑھ گئی۔ اب مختلف قسم کے مذہبی اور ثقافتی وفد چین جانے لگے۔ چین کے رسائل میں مغربی دنیا کے مضامین چھپنے لگے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی دنیا کے افکار چین کے اندر پہنچنے لگے۔ جو کمیونسٹ انقلاب کے بعد بالکل بند تھے ——— انفرادیت پسندی، فکری آزادی اور مذہبی خیالات جو چین میں اب تک ممنوع تھے وہ مغرب کے واسطے سے چین میں درآمد ہونے لگے۔ یہ کمیونسٹ نظریہ کے خلاف زبردست چیلنج تھا۔ یہ اس نظام فکر کو منہدم کرنے کے ہم معنی تھا جس پر کمیونسٹ چین کا سیاسی ڈھانچہ قائم ہے۔ چنانچہ چین میں اس "روحانی کثافت" کے خلاف سرکاری سطح پر زبردست مہم شروع ہو گئی ہے۔ حکومت چاہتی ہے کہ اس نئی کثافت سے اپنے ملک کو یکسر پاک کر دے (ٹائمس آف انڈیا 9 نومبر 1983)

کمیونسٹ حضرات کا دعویٰ ہے کہ ان کا نظریہ تمام نظریات میں سب سے زیادہ صحیح نظریہ ہے۔ انسان کی فکری تلاش اپنے لمبے تجربہ کے بعد جس آخری سچائی پر پہنچی ہے وہ وہی ہے جس کو کمیونزم کہتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو کمیونسٹ نظام غیر کمیونسٹ نظریہ سے خائف کیوں ہے۔ حق کو ناحق سے خطرہ کیوں درپیش ہے۔ اعلیٰ نظریہ کمتر نظریہ کے مقابلہ میں اپنے کو دفاعی پوزیشن میں کیوں محسوس کرتا ہے۔

کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس چیز کو کمیونسٹ مفکرین نے آخری سچائی سمجھا تھا وہ محض ایک احمقانہ فریب تھا۔ ان کا اجالا درحقیقت اندھیرا تھا جس کو انھوں نے غلطی سے اجالا سمجھ لیا۔

نازک سوال

آرتھر کونسلر موت کی طرف سفر کو نامعلوم ملک (Unknown Country) کی طرف سفر کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا سب سے عجیب اور پر اسرار واقعہ ہے۔ ہر آدمی متجسس ہوتا ہے کہ یہ معلوم کرے کہ مر کر وہ کہاں پہنچنے والا ہے۔

امریکہ کے مشہور مشنری ڈاکٹر بلی گرہم کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے مسرّت کا راز (The Secret of Happiness) اس کتاب میں بلی گرہم نے لکھا ہے کہ ایک بار مجھے دنیا کے ایک بہت بڑے لیڈر کا ارجنٹ پیغام ملا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ فوراً مجھ سے ملاقات کرو۔

میں روانہ ہو کر مذکورہ لیڈر کے یہاں پہنچا۔ جب میں لیڈر سے اس کے دفتر میں ملا تو وہ فوراً مجھے الگ کمرہ میں لے گیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑے موثر لہجہ میں کہا:

I am an old man. Life has lost all meaning. I am ready to take a fateful leap into the Unknown. Young man, can you give me a ray of hope.

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھو دی ہے۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان شخص، کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن دے سکتے ہو۔

موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی کی عمر میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر بالآخر تقدیر کا فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کی طاقتیں گھٹ جاتی ہیں۔ تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب میں بہرحال جلد ہی مر جاؤں گا۔ اس وقت وہ مجبور ہوتا ہے کہ سوچے کہ "موت کے بعد کیا ہونے والا ہے"، اسے تلاش ہوتی ہے کہ وہ کوئی امید کی کرن پائے جو موت کے بعد آنے والے حالات میں اس کی زندگی کو تابناک کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر اسی امید کی روشنی کو دینے کے لئے آئے۔ پیغمبروں نے انسان کو بتایا کہ موت کے بعد ایک اور دنیا ہے جو ابدی بھی ہے اور معیاری بھی۔ موت کے بعد کی اس کامل دنیا میں اس کو داخلہ ملے گا جو موت سے پہلے کی دنیا میں صالح اعمال سے اس کا استحقاق ثابت کرے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے:

...and God calls to the home of peace.

اور خدا امن کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ (واللہ یدعوا الیٰ دار السلام، یونس ۲۵)

مذہب پر سائنسی استدلال

قدیم زمانہ میں پانی کو صرف پانی سمجھا جاتا تھا۔ انیسویں صدی میں خوردبین ایجاد ہوئی۔ خوردبین سے جب پانی کو دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ پانی صرف پانی نہیں ہے۔ اس میں بے شمار زندہ بیکٹیریا بھی موجود ہیں۔ اسی طرح آسمان پر جو ستارے نظر آتے ہیں، آدمی نے سمجھا کہ وہ تعداد میں اتنے ہی ہیں جتنا کہ بظاہر ننگی آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب آسمان کا مشاہدہ دوربین سے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ستارے اس سے بہت زیادہ تعداد میں ہیں جو بظاہر خالی آنکھ سے نظر آتے ہیں۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے قدیم زمانہ اور جدید زمانہ کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جدید زمانہ کے یہ مشاہدات یقینی طور پر بتا رہے تھے کہ حقائق اس سے بہت زیادہ ہیں جو انسان نے اپنے سادہ مشاہدہ کے دائرے میں اس سے پہلے سمجھ رکھا تھا۔ مگر جو لوگ ان نئے مشاہدات کو سامنے لا رہے تھے وہ اپنی دریافتوں کی بنا پر اتنے زیادہ جوش میں تھے کہ انھوں نے ایک اور دعویٰ کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ حقیقت وہی ہے جو براہ راست ہمارے مشاہدے میں آئے۔ جو چیز ہمارے براہ راست مشاہدے اور تجربہ میں نہ آئے وہ محض مفروضہ ہے، اس کا کوئی وجود نہیں۔

انیسویں صدی میں یہ دعویٰ بہت زور شور کے ساتھ کیا گیا۔ اس دعویٰ کی زد سب سے زیادہ مذہب پر پڑتی تھی۔ مذہب جن اعتقادات کا مبلغ ہے وہ سب غیبی اعتقادات ہیں، یعنی وہ براہ راست ہمارے تجربہ اور مشاہدہ میں نہیں آتے۔ اس بنا پر بہت سے لوگوں نے سمجھ لیا کہ مذہب ایک فرضی چیز ہے، اس کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔

مگر بیسویں صدی کی تحقیقات نے اس صورت حال کو بالکل بدل دیا ہے۔ مزید مطالعہ کے بعد انسان کو یہ معلوم ہوا کہ حقائق صرف اتنے ہی نہیں ہیں جو براہ راست ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں بلکہ ان مشاہدات کے ماورا بھی بہت سی حقیقتیں ہیں۔ بلکہ تمام بڑی بڑی حقیقتیں مشاہدات کے ماورا ہی پائی جاتی ہیں۔

برٹرینڈ رسل کے الفاظ میں علم کی دو قسمیں ہیں، چیزوں کا علم (Knowledge of things) اور صداقتوں کا علم (Knowledge of Truths) ہم براہ راست طور پر صرف "چیزوں" کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے بعد جو "صداقتیں" ہیں، وہ صرف بالواسطہ مشاہدہ، بالفاظ دیگر صرف استنباط (Inference) کے ذریعہ جانی جا سکتی ہیں، مثال کے طور پر روشنی (Light) کشش (Gravity) مقناطیسیت

(Magnetism) جوہری طاقت (Nuclear Energy) وغیرہ۔ یہ سب بلاشبہ کائنات کی مسلمہ حقیقتیں ہیں، مگر انسان ان کو براہ راست طور پر نہیں دیکھتا۔ وہ صرف ان کے اثرات (Effects) کے ذریعہ ان کو جانتا ہے۔ انسان کے تجربہ میں کچھ "چیزیں" آتی ہیں جن سے وہ مستنبط کرتا ہے کہ فلاں فلاں "صداقتیں" یہاں پائی جارہی ہیں۔

بیسویں صدی میں علم کی اس تبدیلی نے بنیادی طور پر سارے معاملہ کو بدل دیا۔ انسان مجبور ہوگیا کہ وہ ایسی چیزوں کے وجود کا اعتراف کرے جن کو وہ براہ راست نہیں دیکھتا۔ البتہ بالواسطہ تجربات بتاتے ہیں فلاں قسم کی حقیقت یہاں موجود ہونی چاہئے۔ علم کی اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار یہ کیا کہ مشاہداتی حقیقت اور غیبی حقیقت کے فرق کو ختم کر دیا۔ اب نہ دیکھی جانے والی چیز بھی اتنی ہی اہم بن گئی جتنی کہ دیکھی جانے والی چیز۔ انسان مجبور ہوگیا کہ یہ مانے کہ بالواسطہ استدلال یا استنباطی استدلال (Inferential Argument) بھی علمی طور پر اتنا ہی معقول (Valid) ہے جتنا کہ براہ راست استدلال (Direct Argument)

علم میں اس تبدیلی نے موجودہ زمانہ میں الہیاتی استدلال کو عین سائنٹفک استدلال بنا دیا ہے۔ مثلاً خدا کے وجود پر علمائے الہیات کا سب سے بڑا استدلال وہ ہے جس کو فلاسفہ نظم سے استدلال (Argument from Design) کہتے ہیں۔ یہ استدلال انیسویں صدی کے پرجوش علماء نے نہیں مانا۔ انھوں نے کہا کہ یہ استنباطی استدلال ہے اور استنباطی استدلال علمی طور پر معقول نہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں اس اعتراض کی بنیاد ختم ہو چکی ہے۔ آج کا انسان مجبور ہے کہ وہ نظم کائنات سے ناظم کائنات پر استدلال کو اتنا ہی علمی اور معقول مانے جتنا کہ وہ مشین کے پہیہ کی حرکت سے Flow of electron کے نظریہ کو معقول سمجھتا ہے۔

اعلان

ماہنامہ الرسالہ کے پچھلے شمارے برائے فروخت دفتر الرسالہ میں موجود ہیں۔ شائقین طلب فرمائیں۔ مکمل فائل کی قیمت ۲۶ روپیہ فی سال (بغیر کمیشن) ہوگی۔ جلد کی قیمت علیحدہ چارج کی جائے گی۔ متفرق شماروں پر کمیشن ۲۵ فی صد۔

منیجر الرسالہ

ناقص تجزیہ

ایک مشہور عالم اور قائد نے اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی ہے۔ اس میں وہ "الغار خلافت کا منحوس اقدام" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

"خلافت ایک دینی منصب اور اس کا قائم رکھنا مسلمانوں کا دینی فریضہ تھا۔ قرون اولیٰ کے مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر وقفہ بھی خلیفۃ المسلمین کی موجودگی کے بغیر گذر سکتا تھا..... لیکن بالآخر جو منصب جلیل وفات رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد سے کسی نہ کسی شکل میں اس وقت تک چلا آرہا تھا، اور عثمانیوں نے (اپنی ساری کمزوریوں اور بہت سی قابل گرفت باتوں کے باوجود) اس کی شان و شوکت قائم رکھی تھی اور یورپ کے دل پر اس کی دھاک بٹھا رکھی تھی اور جو حرمین شریفین کی پاسبان و محافظ تھی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ میں اس کا کمال اتاترک کے (جس کا ہندستانی مسلمان اپنی ناواقفیت کی بنا پر عرصہ تک کلمہ پڑھتے رہے تھے) ہاتھوں بیک گردش قلم وجنبش لب خاتمہ ہوگیا۔ اگر پوچھا جائے کہ عالم اسلام کے لئے آخری صدیوں کی طویل تاریخ میں منحوس ترین دن کون تھا؟ تو ایک باخبر اور حقیقت پسند مورخ اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتا کہ ۳۰ مارچ ۱۹۲۴ کی تاریخ تھی جب ٹرکی کی مجلس وطنی (پارلیمنٹ) نے الغار خلافت کا فیصلہ کیا اور مقامات مقدسہ ہی نہیں مسلمانوں کی عزت و آبرو کا وہ مضبوط حصار ٹوٹ گیا جس کو ترکوں نے اپنی قربانیوں، فوجی طاقت اور خلافت کے مقدس نام سے تعمیر کیا تھا۔" (کاروان حیات صفحہ ۷۴ - ۷۵)

یہ تاریخ کا بے حد ناقص مطالعہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ ایک شخص نے مسلمانان عالم کے سیاسی ادارہ (خلافت) کو ختم کر دیا یا ایک شخص اس کو ختم کر سکتا تھا۔ اس قسم کے واقعات وسیع تر تاریخی عوامل کے تحت ہوتے ہیں نہ کہ کسی فرد واحد کی کارروائی کے تحت۔

مذکورہ عالم اور قائد ایک بہت بڑی اسلامی درس گاہ کے ناظم ہیں۔ اگر وہ کسی دن اعلان کر دیں کہ آج سے یہ درس گاہ ختم کی جاتی ہے تو کیا وہ ختم ہو جائے گی۔ یا وہ اعلان کریں کہ اب یہ اسلامی تعلیم کی درس گاہ نہیں ہوگی بلکہ یہاں ہندو ازم اور بدھ ازم کی تعلیم دی جائے گی تو ان کے اعلان کی بنا پر کیا یہ اسلامی درس گاہ ہندو درس گاہ بن جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی "اتاترک" خلافت اسلامی کے عالمی ادارہ کو محض اپنے فیصلہ سے ختم کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اسلامی کا ادارہ اس لئے ختم ہوا کہ تاریخی حالات نے اس کو ختم

کر دیا تھا۔ اتاترک نے صرف ایک ہونے والے واقعہ کا اعلان کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۲۴ تک عثمانی خلافت کے ماتحت مسلم ممالک میں قومی تحریکیں زبردست قوت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ یہ تحریکیں شدت کے اس درجہ تک پہنچ چکی تھیں کہ ترکی میں بیٹھ کر ان ممالک پر حکومت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ گویا تقریباً وہی صورت حال تھی جو موجودہ صدی کے وسط میں برطانیہ کے لئے ہندستان میں پیدا ہو چکی تھی۔ برطانی وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے ہندستان کو برطانی غلامی سے آزاد نہیں کیا بلکہ ایک ہونے والے واقعہ کا سیاسی اعتراف کر لیا۔ اسی طرح کمال اتاترک نے حقیقۃً خلافت کو ختم نہیں کیا بلکہ وہ خلافت جس کو اس کے ماتحت مسلم ممالک اپنے قومی جوش کے تحت قبول کرنے سے انکار کر چکے تھے اس کو مان لیا اور ان ملکوں کی خواہش کے مطابق انھیں قومی آزادی دے دی۔

اس زمانہ میں عرب ممالک قومی جذبات سے اس قدر سرشار تھے کہ ان کے درمیان اگر کوئی سمجھ دار آدمی خلافت کو باقی رکھنے کی بات کرتا تو وہ اس کو قومی غدار سمجھ لیتے۔ ایک بڑے عرب عالم جو خلافت کی ماتحتی کو باقی رکھنا چاہتے تھے جب ان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑا تو انھوں نے کہا:

سیعلم قومی انی لا اغشھم

ومھما استطال اللیل فالصبح واصل

جلد ہی میری قوم جان لے گی کہ میں نے اس کو دھوکا نہیں دیا ہے اور رات کتنی ہی لمبی ہو بہر حال اس کے بعد صبح آتی ہے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو لیڈر اٹھے انھوں نے حالات کا تجزیہ کرنے میں کتنی زبردست غلطیاں کیں۔ اور جب تجزیہ غلط ہو تو لازمی طور پر عملی پروگرام بھی غلط اور بے نتیجہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر مسلم لیڈر کسی نہ کسی فرد کو مسلم مصائب کا ذمہ دار قرار دے کر اس کے خلاف طوفان مچاتے رہتے ہیں۔ مگر جب وہ اس فرد کو ختم کر لیتے ہیں یا اس کو سولی پر چڑھا دیتے ہیں تو اس کے بعد بھی مسائل بدستور باقی رہتے ہیں۔ جن لوگوں کے بس میں قتل کرنا ہے وہ قتل کر رہے ہیں۔ جن کے پاس قتل کرنے کی طاقت نہیں وہ مفروضہ ذمہ دار شخص کے خلاف الفاظ کا طوفان مچائے ہوئے ہیں۔

ہمارے مسائل کسی فرد کے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ وہ وسیع تر تاریخی اسباب کے پیدا کردہ ہیں۔ اور جب تک ان تاریخی اسباب کو دور نہ کیا جائے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

حق کی پہچان

شری رام رتن کپلا دہلی میں ریفریجریٹر کے تاجر ہیں اور شری موتی رام صراف دہلی میں سونے چاندی کا کاروبار کرتے ہیں۔ دونوں میں بہت دوستی ہے۔ اکثر صبح کو دونوں ایک ساتھ ٹہلنے کے لئے نکلتے ہیں اور ایک ساتھ واپس آتے ہیں۔

ایک روز دونوں ایک مقام پر ٹہل رہے تھے۔ شری رام رتن کپلا کو ایک جگہ راستے کے کنارے ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی۔ انھوں نے اس کو شیشہ کا ٹکڑا سمجھا اور تفریح کے طور پر ہاتھ میں اٹھا لیا۔

ٹہلنے کے بعد دونوں گھر واپس آئے۔ شری رام رتن کپلا نے واشن بیسن پر ہاتھ دھویا اور مذکورہ ٹکڑے کو بے خیالی کے ساتھ ایک کنارے ڈال دیا۔

اس کے بعد شری موتی رام صراف اپنا ہاتھ دھونے کے لئے واشن بیسن پر آئے۔ ان کی نگاہ مذکورہ ٹکڑے پر پڑی۔ اس کی چمک دیکھتے ہی فوراً انھوں نے پہچان لیا کہ یہ ہیرا ہے۔ انھوں نے اس کو اٹھا لیا اور اس کو دھو کر شری رام رتن کپلا کے پاس لے گئے۔ جب انھوں نے بتایا کہ یہ ہیرا ہے تو شری رام رتن کپلا کو بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے تو اسے معمولی شیشہ کا ٹکڑا سمجھا تھا۔ خیریت ہوئی کہ میں نے اسے پھینک نہیں دیا۔

شری رام رتن کپلا ہیرے سے بے خبر نہ تھے۔ ان کے گھر میں ہیرے کا نیکلس موجود تھا جس کو وہ نہایت احتیاط کے ساتھ اپنی مخصوص الماری میں رکھے ہوئے تھے۔ مگر راستہ میں پڑے ہوئے ہیرے کو وہ پہچان نہ سکے۔

شری موتی رام صراف بھی ہیرے سے واقف تھے اور شری رام رتن کپلا بھی۔ فرق یہ ہے کہ شری موتی رام جوہری تھے۔ وہ ہیرے کو اس کے جوہر کی بنیاد پر پہچان سکتے تھے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ مگر شری رام رتن کپلا صرف اس ہیرے سے واقف تھے جو ان کے معلوم نیکلس میں لگا ہوا ہو۔ معلوم نیکلس کے باہر کسی ہیرے کے ٹکڑے کو پہچاننا انھیں نہیں آتا تھا۔

وہ شخص جوہری نہیں جو ہیرے کو صرف اس وقت پہچانے جب کہ وہ اس کے اپنے ہار میں لگا ہوا ہو۔ جوہری وہ ہے جو ہیرے کو اپنے ہار میں بھی پہچانے اور دوسرے کے ہار میں بھی۔ اسی طرح حق شناس وہ ہے جو حق کو ہر حال میں پہچان لے، خواہ وہ اس کے اپنے حلقہ کے اندر ہو یا اس کے اپنے حلقہ کے باہر۔

دعوتی مشن

ایک غیر مسلم ایک مولوی صاحب کے یہاں آیا اور یہ سوال کیا کہ اسلام کیا ہے۔ مولوی صاحب نے بہت اچھے انداز میں اس کے سامنے توحید اور آخرت اور مساوات بنی آدم کی تشریح کی۔ غیر مسلم جب چلا گیا تو کچھ مسلمان جو وہاں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے، انھوں نے مولوی صاحب سے کہا: حضرت، ہم آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ ہم کو وسیلہ اور زیارت قبر جیسے مسائل کی تفصیل بتاتے ہیں۔ اور غیر مسلم نے آپ سے اسلام کے بارہ میں پوچھا تو آپ نے اس کو دوسری باتیں بتائیں۔ کیا ہمارا اسلام اور ہے اور ان کا اسلام اور۔ اس کے جواب میں مولوی صاحب نے کہا:

"اجی، یہ غیر مسلم ہمارے ان جھگڑوں کو کیا سمجھیں گے۔ ان کو تو اسلام کی بنیادی باتیں ہی بتائی جا سکتی ہیں۔"

مسلمانوں کو آج جہاں دیکھئے، آپس کے جھگڑوں میں مبتلا ہیں۔ شیعہ اور سنی کا جھگڑا، دیوبندی اور بریلوی کا جھگڑا، حنفی اور اہل حدیث کا جھگڑا۔ ایک جماعت اور دوسری جماعت کا جھگڑا۔ اور یہ سب کچھ عین اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اسلام ان کے نزدیک صرف آپس کے بحث اور جھگڑے کا نام ہے۔

مگر یہی مسلمان جو آپس میں معمولی مسائل اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے جھگڑتے ہیں، انھیں کو اگر غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کرنا ہو تو وہ سنجیدہ اور حقیقت پسند بن جاتے ہیں۔ وہ جھگڑے والی باتوں کو حذف کر کے ان کے سامنے وہ اسلام پیش کرتے ہیں جو بنیادی ہے اور جس میں ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام موجودہ خرابیوں کا سبب یہ ہے کہ وہ دعوت اسلام اور شہادت علی الناس کے کام سے ہٹ گئے ہیں۔ دوبارہ ان کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کو دعوت اسلام اور شہادت علی الناس کے کام پر لگایا جائے۔

دعوت عام کا کام عین اپنی فطرت کے اعتبار سے آدمی کو اسلام کی بنیادی باتوں کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ فروعی چیزیں اپنے آپ حذف ہو جاتی ہیں جو اختلافات کا اصل سبب ہیں۔ غیر مسلموں میں خدا کے دین کو پہنچانے کا کام بیک وقت دعوتی ذمہ داری کی ادائیگی بھی ہے اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی موثر ترین تدبیر بھی۔

قیادت کا المیہ

دہلی میں قانون کے ایک طالب علم سے پوچھا گیا کہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تم کیا کروگے۔ اس نے جواب دیا۔

"چل گئی تو موتی لال، نہیں چلی تو جواہر لال"

ہندستان کی سیاست میں جو لوگ "جواہر لال" بنے وہ وہی تھے جن کی "نہیں چلی تھی"۔ پریکٹس یا کاروبار میں ناکام ہونے والے لوگ سیاست کے میدان میں داخل ہوگئے۔ یہاں عمل کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ تقریریں اور بیانات کافی تھے۔ چنانچہ بہت جلد وہ کامیاب لیڈر بن گئے۔

یہ بات مسلم قیادت کے لئے اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم قیادت سب سے زیادہ ناکام قیادت ثابت ہوئی ہے۔ اس کی غالباً سب سے بڑی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ حقیقی زندگی میں ناکام رہنے والے لوگ قیادت کے میدان میں داخل ہوگئے۔ حقیقی زندگی میں حقیقی لیاقت درکار تھی مگر قیادت کے میدان میں صرف تقریریں اور تحریریں کافی تھیں۔ اور یہ دوسرا سرمایہ ان لوگوں کے پاس کافی مقدار میں موجود تھا۔ عمل کے میدان میں ناکام رہنے والے لوگ الفاظ کے میدان میں آفتاب اور ماہتاب بن کر چمک اٹھے۔

ان لوگوں کے پاس ملّت کو دینے کے لئے کوئی حقیقی عمل نہ تھا۔ ان کے پاس صرف الفاظ تھے جن کے سہارے وہ اپنا مقام پیدا کرسکیں، چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ انھوں نے رومانی شاعری، جذباتی تقریریں مبالغہ آمیز بیانات اور وقتی نعروں اور ہنگاموں پر اپنی قیادت کی عمارت کھڑی کی۔ اس طرح انھیں ذاتی عظمت تو حاصل ہوگئی مگر ملّت کو عظمت کی منزل تک پہنچانے میں وہ سراسر ناکام رہے۔

ایک مثال لیجئے۔ ہندستان کی مسلم قیادت کا ایک اہم اشو انگریزی اخبار رہا ہے۔ "ہندستان کے انگریزی اخبارات مسلم خبروں کی صحیح رپورٹنگ نہیں کرتے"۔ یہ بات تقریباً ہمارے ہر لیڈر کی زبان ہے۔ اس عنوان پر ہمارے لیڈروں نے مسلمانوں کے جذبات اس قدر زیادہ بھڑکائے ہیں کہ حال میں ایک صاحب نے ماہنامہ الرسالہ کے بارے میں کہا کہ الرسالہ میں ٹائمس آف انڈیا کے اقتباسات ہوتے ہیں، جب کہ ٹائمس آف انڈیا مسلمانوں کا دشمن نمبر ایک ہے۔ ان کے نزدیک چوں کہ الرسالہ میں دشمن اخبار کے اقتباسات چھپتے ہیں اس لئے الرسالہ مسلمانوں کو پڑھنا نہیں چاہئے۔

اس قسم کی لایعنی باتوں کی ذمہ داری تمام تر ہماری مسلم قیادت پر ہے۔ وہ ہندستان کے موجودہ

انگریزی اخبارات کے خلاف جو شیلے بیانات دیتے ہیں۔ وہ "مسلمانوں کے انگریزی اخبار" کے نام پر بڑے بڑے چندے وصول کرتے ہیں مگر یہ سب کچھ محض لفظی پہلوانی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج تک مسلمانوں کا انگریزی اخبار وجود میں نہ آسکا۔ نہ یہی ممکن ہوا کہ موجودہ انگریزی اخبارات میں مسلمانوں کی کوئی قابل ذکر نمائندگی ہوسکے۔

دوسری طرف اس معاملہ میں ہمسایہ قوموں کا حال دیکھئے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہندستان کی آزادی سے پہلے ہندستان کی انگریزی صحافت انگریزوں یا انگریزوں کے تربیت یافتہ افراد کے ہاتھ میں تھی یہی لوگ اس وقت ملک کی انگریزی صحافت پر چھائے ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد یہ سوال تھا کہ اب اس ملک میں انگریزی صحافت پر کس کا قبضہ ہو۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ سارے ہندستان میں صرف بمبئی یونی ورسٹی میں جرنلزم کا ڈپلوما کورس تھا۔ ڈگری کے درجہ کی تعلیم کے لئے آدمی کو انگلینڈ جانا پڑتا تھا۔ اس وقت ایک سردار پروفیسر نے پنجاب یونی ورسٹی (چنڈی گڑھ) میں جرنلزم کا ڈگری کورس شروع کیا۔ تاہم ابتداءً اس شعبہ کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔ بہت کم طلبہ اس میں داخلہ لینا پسند کرتے تھے۔ جب طلبہ کا پہلا دستہ نظری تعلیم مکمل کرچکا تو اس کی عملی تربیت کی ضرورت پیش آئی۔ مذکورہ پروفیسر ان کو لے کر دہلی آئے تاکہ یہاں کے بڑے بڑے اخبارات اور نیوز ایجنسیوں میں ان کو عملی تربیت کے لئے رکھ سکیں۔ مگر بمشکل کچھ لوگ ان کو اپنے یہاں لینے کے لئے تیار ہوئے۔ تاہم پروفیسر نے اپنی کوشش جاری رکھی یہاں تک کہ ان کے پڑھائے ہوئے طلبہ عملی تربیت پاکر اخباری اداروں میں داخل ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے یہ تناسب بڑھتا رہا۔ بالآخر یہ حال ہوا کہ یہ طلبہ اکثر اخباری اداروں میں نظر آنے لگے۔ پروفیسر موصوف نے اپنی روداد بیان کرتے ہوئے ایک بار کہا ——— پہلی بار جب میں دہلی آیا تھا تو یہاں کسی نے مجھ کو لفٹ نہ دی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ میں انھیں اخباری دفتروں میں آتا ہوں تو آدھے آدمی میرے استقبال کے لئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ میرے شاگرد ہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کام کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ یہ ہے کسان کی طرح خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو نتیجہ خیز کام میں لگانا۔ مذکورہ واقعہ میں ایک شخص نے اپنے آپ کو ملک کی سو یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی کے ایک شعبہ میں وقف کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی انگریزی صحافت پر اس کی قوم کا غلبہ ہوگیا۔ اس کے برعکس جو لوگ احتجاج اور مطالبہ کررہے ہیں وہ اسی مدت میں کوئی بھی صحافتی مقام پیدا نہ کرسکے۔

ایٹمی ہلاکت

امریکہ میں ایک فلم تیار ہوئی ہے جس کا نام ہے ـــــ اگلے دن :

The Day After

اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو اس کے اگلے دن کیا ہوگا۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ جنگ کے بعد زمین کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوگا۔ اور زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوگا۔ حکومت امریکہ کا ردّ عمل اس فلم پر بہت سخت ہوا۔ کیونکہ امریکی حکومت ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری پر جو بے پناہ دولت خرچ کر رہی ہے وہ سب اس کی روشنی میں غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہ بحث اتنی بڑھی کہ امریکی صدر رونالڈ ریگن کو ریڈیو پر ایک تقریر نشر کرنی پڑی۔ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایٹمی جنگ میں اگر امریکہ کو نقصان پہنچے گا تو روس کو اس سے بھی زیادہ نقصان پہنچے گا، اور آزادی محفوظ رہ جائے گی۔

While the U.S. is being hurt, the Russians are being hurt more, and the freedom and liberty will survive.

ان لوگوں کی قسمت بھی کیسی عجیب ہوگی جو ایٹمی جنگ کے بعد آزادی پائیں گے۔ روس کے سابق وزیر اعظم نکیتا خروشچیف اگرچہ خود بھی ایٹمی جنگ کی آگ بھڑکانے میں شریک تھے۔ تاہم انھوں نے اس قسم کے عذر کے لئے بجا طور پر کہا تھا:

It is a case of the living envying the dead

یعنی یہ ایک ایسی زندگی ہوگی جب کہ زندہ رہنے والوں کو مُردوں پر رشک آئے (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ نومبر ۱۹۸۳)

۲۰ نومبر ۱۹۸۳ کو دو نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں نے اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل (Javier Perez de Cuellar) سے مل کر ایک یادداشت ان کے حوالے کی (ٹائمس آف انڈیا ۲۱ نومبر ۱۹۸۳) اس یادداشت پر بارہ ہزار سائنس دانوں کے دستخط ہیں جو کہ چالیس سے زیادہ ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذکورہ نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں کے نام یہ ہیں:

1. Mr. Philip Anderson (Princeton University)
2. Mr. James Cronin (Chicago University)

اس یادداشت میں اقوام متحدہ کی معرفت ایٹمی طاقتوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں پر

مکمل پابندی عائد کریں۔ اس کے الفاظ میں، ہیروشیما اور ناگاساکی کے ۳۸ سال بعد بھی دنیا مستقل طور پر اپنے آپ کو اس خطرہ میں پا رہی ہے کہ ایٹمی جنگ کے ذریعہ اس کا خاتمہ ہو جائے:

Thirty eight years after Hiroshima and Nagasaki the world finds itself under a constant threat of annihilation by nuclear war.

اسی زمانہ میں اس سلسلے کا ایک اور واقعہ پیش آیا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے گئے ہیں۔ ان کے ذریعہ بہت سی نئی باتیں انسان کے علم میں آئی ہیں۔ ان معلوماتی سیاروں پر مخصوص قسم کے کیمرے اور طرح طرح کے آلات نصب ہوتے ہیں جو خلا کے بارے میں مسلسل معلومات زمین پر بھیجتے رہتے ہیں۔

اس طرح جو چیزیں معلوم ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ سیارہ مریخ (Mars) کے چاروں طرف زبردست مقدار میں گرد کا طوفان چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ سورج کی شعاعیں مریخ کی سطح پر نہیں پہنچ پاتیں اور اس بنا پر مریخ کا ٹمپریچر خطرناک حد تک کم ہو گیا ہے۔

اس دریافت نے دو سائنس دانوں کو متاثر کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ ایٹمی انفجار سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ بہت بڑی مقدار میں زمینی ذرات اڑ کر فضا میں چلے جاتے ہیں (ایک میگاٹن بم کے پھٹنے سے ایک لاکھ ٹن سے زیادہ ذرات) اب ان کے سامنے یہ سوال آگیا کہ اگر ایٹمی جنگ ہو تو ایٹم بم کے پھٹنے سے جو ذرات اڑ کر فضا میں پہنچیں گے ان کے اثرات زمین پر کیا ہوں گے۔

اس ابتدائی سوال سے آغاز کر کے انھوں نے تحقیق شروع کی تو ان کے مطالعہ کے نتائج ایک پوری کتاب کی صورت اختیار کر گئے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل نام سے شائع ہوئی ہے ـــــ ایٹمی جنگ کے طویل المدت حیاتیاتی نتائج:

The Long-Term Biological consequences of Nuclear War

اس کتاب کے مصنف اسٹینفورڈ کے پال اہرلچ (Paul Ehrlich) اور کارنیل کے کارل ساگن (Carl Sagan) ہیں۔ اس کے علاوہ مزید ۸۰ سائنس دانوں نے کتاب پر تصدیقی دستخط کئے ہیں۔ اس کتاب میں فنی تجزیہ کر کے بتایا گیا ہے کہ ایٹمی جنگ کا مطلب ہے زمین سے انسانی نسل کا خاتمہ:

Nuclear warfare means the extinction of the human race.
when the missiles fly, the end is nigh.

ایٹمی جنگ ہوئی تو دفعۃً اربوں انسان مر جائیں گے۔ اور جو لوگ اپاہج اور زخمی ہو کر بچیں گے وہ بھی

جلد ہی موت کا شکار ہو جائیں گے۔ کیوں کہ زمین پر ان کے سانس لینے کے لئے زہریلی گیس ہوگی۔ نیز غیر معمولی ٹھنڈ، اندھیرا اور ریڈیائی تابکاری۔ ایٹمی جنگ اگرچہ مدت کے اعتبار سے تاریخ کی مختصر ترین جنگ ہوگی مگر اپنے بعد وہ ایسی دنیا چھوڑے گی جس میں انسان جیسی مخلوق زندہ نہیں رہ سکتی۔

انسانیت کی بچی ہوئی نسل زمین پر سخت ٹھنڈک کی وجہ سے مفلوج ہو جائے گی اور تاریکی کی بنا پر تمام موجودہ سرگرمیاں ختم ہو جائیں گی۔ فضا میں دھوئیں اور گرد کی وجہ سے سورج کی شعاعیں سطح زمین پر نہیں پہنچیں گی۔ ٹمپریچر خطرناک حد تک کم ہو جائے گا اور زمین ایٹمی سردی (Nuclear winter) کے حوالے ہو جائے گی۔

امریکہ اور روس کے پاس جو دور مار میزائل ہیں ان کی مجموعی مقدار تقریباً پانچ ہزار میگا ٹن ہے۔ اگر ایٹمی جنگ میں یہ سب کے سب استعمال ہو جائیں تو زمین کے تقریباً نصف حصہ پر کم از کم عارضی طور برفانی دور (Ice age) جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ ایٹمی جنگ کے بعد زمین پر جو حالات پیدا ہوں گے وہ مذکورہ تحقیق کے مطابق مختصر طور پر یہ ہیں:

۲۲۵ ملین ٹن دھواں فضا میں داخل ہوگا۔ یہ دھواں اتنا زیادہ ہے کہ وہ زمین کے بڑے حصہ کو ڈھانک لینے کے لئے کافی ہے، اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ زمین تک پہنچنے والی سورج کی شعاعیں تقریباً ۹۰ فی صد تک آنے سے رک جائیں گی۔

زمین کا تقریباً نصف حصہ بالکل رات کی طرح تاریک ہو جائے گا۔ ٹمپریچر نقطۂ انجماد سے نیچے آجائے گا اور یہ حالت تقریباً تین مہینے تک باقی رہے گی۔

سورج کی شعاعوں کے زمین تک نہ پہنچنے سے فوٹو سنتھے سس (Photo-synthesis) کا عمل رک جائے گا جس کی وجہ سے پودے اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ سن لائٹ کو انرجی میں تبدیل کر سکیں۔ یہ وہ کلیدی عمل ہے جو زندگی کے لئے مددگار ہے۔ اس کے نتیجہ میں زمین پر پودے ختم ہو جائیں گے اور اسی کے ساتھ وہ جاندار بھی جو پودوں پر پرورش پاتے ہیں۔

جب تاریکی اور ٹھنڈ ختم ہوگی تو ایک اور شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ ایٹمی دھماکوں سے پیدا ہونے والے کیمیائی ردعمل کا یہ نتیجہ ہوگا کہ فضا میں اوزون کی تہ Ozone layer موجودہ شکل میں باقی نہ رہے گی۔ اوزون گیس کی یہ تہ سورج کی نقصان دہ الٹرا وائلٹ شعاعوں کو زمین پر آنے سے روکتی ہے۔ چنانچہ الٹرا وائلٹ شعاعوں کی آمد کی وجہ سے حیاتیاتی اجسام شدید طور پر متاثر ہوں گے۔ جو انسان ایٹمی عذاب سے بچیں گے وہ بعد کو ان مہلک شعاعوں کی وجہ سے اندھے ہو جائیں گے۔

اس ہولناک ایٹمی جنگ سے بچنے کی تدبیر کیا ہے، یہ سوال مذکورہ دونوں سائنس دانوں سے ایک نیوز کانفرنس میں پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا کہ سائنسی صداقت فیصلہ کرنے والوں کو رکنے پر مجبور کر دینے والی ثابت ہوگی۔

Scientific truth will prove compeling to decision-makers

اخبار گارجین (۱۳ نومبر ۱۹۸۳) کے کالم نگار نے بجا طور پر اس کو سادگی کا نظریہ (Naive theory) کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی واقفیت اگر روکنے والی ہوتی تو فیصلہ کرنے والوں کو پہلے ہی روک چکی ہوتی۔ مہلک ایٹمی ہتھیار اس واقفیت کے باوجود بنائے گئے ہیں۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ قومی دولت کے بے پناہ ضیاع کے بعد اسی لئے بنائے گئے ہیں کہ ان میں اتنی غیر معمولی ہلاکت کا سامان ہے۔ پھر جب ہلاکت خیزی کا علم ان ہتھیاروں کو بنانے میں مانع نہیں ہوا تو وہ ان کے استعمال میں کیوں مانع ہو جائے گا۔

ایٹمی جنگ سے بچنے کا حل صرف ایک ہے۔ اور وہ خدا کا خوف ہے۔ "فیصلہ کرنے والوں" کو عظیم اور برتر خدا کے خوف کے سوا کوئی اور چیز روکنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔ تمام مفسدانہ سرگرمیاں جو زمین پر جاری ہیں وہ اسی لئے جاری ہیں کہ انسان اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے کہ اس کے اوپر کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں۔ کوئی اس کے اعمال پر اس کو پکڑنے والا نہیں۔ یہ صرف خدا سے بے خوفی کا نتیجہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو خوف اور دہشت میں مبتلا کئے ہوئے ہے۔

اگر انسان یہ جان لے کہ حقیقت واقعہ اس کے برعکس ہے۔ انسان خود مختار نہیں بلکہ مسئول ہے، تو وہ اس قسم کی تمام کارروائیوں سے یک لخت رک جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اوپر ایک خدا ہے۔ وہ ہر ایک کے اوپر کامل اختیار رکھتا ہے۔ وہ انسان کی تمام کارروائیوں سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ آخر میں ہر ایک کو پکڑے گا اور فساد کرنے والوں کو سخت ترین سزا دے گا، ایسی سزا جس کا سلسلہ ابدی طور پر جاری رہے گا۔ یہی علم انسان کو فساد سے روک سکتا ہے۔

آج جو لوگ مہلک ہتھیاروں کے بنانے میں مشغول ہیں وہ اسی لئے مشغول ہیں کہ انھیں یقین ہے کہ یہ مہلک ہتھیار صرف دوسروں کے خلاف استعمال ہوں گے۔ اگر وہ جان لیں کہ ان کے اوپر ایک اور زبردست ہستی ہے۔ وہ اتنی طاقت ور ہے کہ ان کے تمام ہتھیاروں کو اکھٹا کر کے خود انھیں کے سروں پر پٹک دے تو وہ فوراً سہم اٹھیں گے اور ایسی تمام سرگرمیوں سے اچانک دست کش ہو جائیں گے۔ خدا کے سامنے جواب دہی کا عقیدہ "ہلاکت" کے مسئلہ کو آدمی کا ذاتی مسئلہ بنا دیتا ہے اور ذاتی مسئلہ سے بڑی کوئی چیز نہیں جو انسان کو کسی عمل سے روکنے والی ثابت ہو۔

فیصلہ کے دن

انڈین اکسپریس (بنگلور) کی اشاعت مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۳ کی ایک خبر کا عنوان ہے چمک دار چیز سونا نہیں ! Glitter is not gold

خبر میں بتایا گیا ہے کہ مس سبل ڈی سلوا (Miss Sybil D'Silva) جو بنگلور میں آرٹیلری روڈ پر رہتی ہیں، وہ اپنے گھر پر تھیں کہ تقریباً ۴۵ سال کی ایک عورت ان کے پاس آئی۔ اس کی گود میں چھ مہینہ کا ایک بچہ تھا۔ عورت نے مس ڈی سلوا سے کہا کہ اس کا شوہر بہت زیادہ بیمار ہے اور اس کے علاج کے لئے فوری طور پر ۵ ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ عورت نے سونے کا ایک ہار اپنی جیب سے نکالا اور کہا کہ میں آپ سے بھیک نہیں مانگ رہی ہوں۔ میں صرف اس سونے کے ہار کو بیچنا چاہتی ہوں۔ اگرچہ یہ ہار مجھے بہت عزیز ہے مگر شوہر کی صحت اس سے زیادہ عزیز ہے۔ اس ہار کی قیمت بازار میں دس ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔ میں اپنی ضرورت کی بنا پر آپ کو صرف ۵ ہزار میں دے دوں گی۔

مس ڈی سلوا نے ہار لینے سے انکار کیا لیکن عورت اپنی مجبوری بیان کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے مس ڈی سلوا کو متاثر کر لیا۔ انھوں نے روپیہ دے کر ہار خرید لیا۔

اگلے دن مس ڈی سلوا بنگلور کی کمرشل اسٹریٹ پر گئیں اور وہاں ایک سنار کو انھوں نے وہ ہار دکھایا۔ سنار نے وہ ہار لے کر اپنی کسوٹی پر جانچا۔ کسوٹی پر جانچنے کے بعد ہار کی حقیقت کھل گئی۔ مس ڈی سلوا نے بنگلور پولیس کو یہ کہانی سناتے ہوئے کہا کہ سنار نے مجھے بتایا کہ یہ تو پیتل ہے۔

He told me it was brass

یہی آخرت کا معاملہ بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے کئے پر مگن ہے۔ ہر آدمی اپنے کام کو سونا سمجھتا ہے۔ مگر کوئی سونا اسی وقت سونا ہے جب کہ وہ سنار کی کسوٹی پر بھی سونا ثابت ہو۔ آخرت میں خدا ہر آدمی کے عمل کو اپنی کسوٹی پر جانچے گا۔ جس کا عمل وہاں کی جانچ میں سونا ثابت ہوا اسی کے عمل کی قیمت ہے، اور جس کے عمل کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہ تو پیتل تھا، اس کا سونا اس کے لئے صرف رسوائی اور بربادی کی علامت ہوگا۔ جس چیز کو آدمی آج اتنا قیمتی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ اس کو کسی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس دن وہ اس سے اتنا بیزار ہوگا کہ وہ چاہے گا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان جدائی ہو جائے مگر اس دن جدائی نہ ہو سکے گی۔ جس چیز کو وہ فخر کی چیز سمجھے ہوئے تھا، اس دن وہ اس کے لئے صرف ذلت اور رسوائی کی چیز بن جائے گی۔

قرآن کا ترجمہ

۵ جنوری ۱۹۸۳ کا واقعہ ہے۔ میں افریقہ کے ایک سفر سے دہلی واپس آ رہا تھا۔ روم میں ایک مستشرق ہمارے جہاز میں سوار ہوئے اور میری سیٹ کی بغل والی سیٹ پر بیٹھے۔ ان کا ذکر میں نے اپنے سفرنامہ مطبوعہ الرسالہ نومبر ۱۹۸۳ میں کیا ہے۔ اس مستشرق کا نام و پتہ حسب ذیل ہے۔

Dr. J. Oacek, Oriental Department,
Charles University, Prague, Czechoslovakia.

چیکوسلاواکیا کے اس مستشرق نے گفتگو کے دوران بتایا کہ چیکوسلواکیا کے ایک مستشرق نے قرآن کا ترجمہ چیک زبان میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ ترجمہ بہت اچھا ہے۔ وہ جب چھپ کر بازار میں آیا تو چند ہفتہ کے اندر اس کے تمام نسخے فروخت ہو گئے۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں دعوت اسلام کے کتنے زیادہ مواقع ہیں۔ آج ساری دنیا میں بے شمار لوگ ہیں جو اسلام کا مطالعہ اس کے اصل اور براہ راست ذرائع سے کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کی مطلوبہ کتابیں ابھی ان کو بہت کم فراہم کی جا سکی ہیں۔ خاص طور پر ضرورت ہے کہ قرآن کا ترجمہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی زبان میں کیا جائے اور اس کو چھاپ کر بڑے پیمانہ پر ساری دنیا میں پھیلا دیا جائے۔

مگر مسلمانوں کو ابھی اس کام سے بہت کم رغبت ہو سکی ہے۔ جنوبی ہند کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے مجھ سے کہا کہ میرے ایک عیسائی دوست نے قرآن کا ایک ترجمہ خریدا۔ اس کے بعد جب اس عیسائی دوست سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ آپ لوگ عیسائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجھے قرآن کے ترجمہ کی ضرورت تھی تو وہ مشکل سے مجھے اتنی قیمت پر ملا۔ اس کے برعکس عیسائیوں کا یہ حال ہے کہ اگر میں ٹیلی فون کر دوں کہ مجھے مفت تقسیم کے لئے انجیل کی ضرورت ہے تو چند گھنٹہ کے اندر پانچ ہزار نسخے میرے دفتر میں آ جائیں گے۔

سعودی عرب اور بعض دوسرے مسلم ممالک نے موجودہ زمانہ میں یہ اہتمام کیا ہے کہ وہ قرآن کے ترجمے چھاپ کر پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ کوششیں اصل ضرورت کے مقابلہ میں ابھی بہت کم ہیں۔ اور ان کا ترجمہ بھی پوری طرح قابل اعتماد نہیں۔

مسلمان سچے دین کے حامل ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ خدا کے دین کو اس کے تمام بندوں تک پہنچائیں۔ مگر یہی وہ کام ہے جس سے آج مسلمان سب سے زیادہ دور ہو رہے ہیں۔

چھوڑنے کے لئے

برطانی دورِ حکومت میں ہندستان کا دار السلطنت کلکتہ تھا۔ ۱۹۱۱ میں برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ دار السلطنت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔ انگریز ماہر تعمیرات سر ایڈون لیوٹنس (۱۸۶۹-۱۹۴۴) نے نئے دار السلطنت کا نقشہ بنایا۔ ۱۹۱۳ میں پرانی دہلی کے جنوب میں رائے سینا پہاڑیوں کے علاقہ میں تعمیرات شروع ہوئیں۔ بالآخر وہ عالی شان آبادی وجود میں آئی جس کو نئی دہلی کہا جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ ساری دنیا میں ایک نئی سیاسی لہر آچکی تھی۔ یہ قومی تحریکوں کی لہر تھی۔ سیاسی افکار کی دنیا میں نئے انقلابات نے نوآبادیاتی نظام کا جواز ختم کر دیا تھا۔ ہندستان میں آزادی کی تحریک تیزی سے جڑ پکڑ رہی تھی۔ بظاہر یہ بات کھل چکی تھی کہ ہندستان میں برطانیہ کی حکومت اب زیادہ دیر تک باقی رہنے والی نہیں۔

نئی دہلی کی تعمیر کے بعد اسی زمانہ میں فرانس کے ایک لیڈر نے ہندستان کا دورہ کیا۔ جب وہ نئی دہلی آئے اور یہاں نیا تعمیر شدہ عظیم دار السلطنت دیکھا تو انھوں نے اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا: ——— انھوں نے کیسی شاندار دنیا بنائی ہے، صرف اس لئے کہ وہ اسے چھوڑ دیں:

What a magnificent world they built to leave

یہ کہانی صرف برطانیہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ یہاں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کو لئے ہوئے دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی تمام قوتوں کا استعمال کر کے وہ اپنا ایک "شاندار گھر" بناتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ اس کی آرزوؤں کا گھر بن کر مکمل ہوتا ہے، اچانک موت کا فرشتہ آجاتا ہے اور اس کو اس کی محنتوں سے بنائی ہوئی دنیا سے جدا کر کے وہاں پہنچا دیتا ہے جس کو آرتھر کونلر نے نامعلوم ملک Unknown Country کا نام دیا ہے۔

زندگی کی کہانی اگر اتنی ہی ہو تو وہ کیسی عجیب دردناک کہانی ہے۔ مگر جس طرح دنیا کی ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا کا بھی ایک تکمیلی جوڑا ہے۔ اور وہ جوڑا آخرت ہے۔ جو شخص آخرت کو بھولا ہوا ہے اس کی زندگی یقیناً صرف ایک المیہ ہے۔ مگر جو شخص امکان آخرت سے فائدہ اٹھائے اور موجودہ دنیا کے مواقع کو اگلی دنیا کی تعمیر میں صرف کرے۔ اس کے لئے موجودہ دنیا ایک نئی زیادہ کامیاب زندگی کا قیمتی زینہ بن جائے گی۔

آخرت کے بغیر انسان کی زندگی صرف ایک المیہ ہے۔ مگر آخرت کو ملانے کے بعد وہ ایک طربیہ میں بدل جاتی ہے۔

نزولی تکمیل نہ کہ ارتقائی تکمیل

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں کہا گیا ہے کہ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو پورا کر دیا۔ اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمہارے لئے میں دین اسلام پر راضی ہو گیا۔

اس آیت میں اکمال دین سے مراد علی الاطلاق دین خداوندی کی تکمیل نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے ان کے دین کی تکمیل ہے۔ یہاں اکمال کا مفہوم وہی ہے جس کے لئے انگریزی میں to conclude کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کے نام سے خدا کی جو عربی کتاب جزء جزء کر کے اتر رہی تھی اور ۲۳ سال تک اترتی رہی، اب اس کا آخری جزء آگیا اور قرآن کے نزول کی تکمیل ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسانیت کے ابتدائی زمانہ سے جو دین اترنا شروع ہوا، وہ ارتقائی سفر کرتے کرتے اب اپنی آخری تکمیلی صورت میں نازل کر دیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں قرآن عربی کی نزولی تکمیل مراد ہے نہ کہ علی الاطلاق دین خداوندی کی ارتقائی تکمیل۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی آیت (المائدہ ۳) میں الیوم اکملت لکم دینکم (آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا) کے الفاظ ہیں نہ کہ الیوم اکملت الدین (آج میں نے دین کو کامل کر دیا) کے الفاظ۔ آیت کے یہ الفاظ انکار کرتے ہیں کہ اس سے مطلق معنوں میں دین کا مکمل کیا جانا مراد لیا جائے۔

اللہ کی کتاب ہدایت اصلاً ایک ہی ہے جس کو قرآن میں ام الکتاب کہا گیا ہے۔ مختلف انبیاء پر جو کتابیں اتریں وہ اسی ام الکتاب کے اڈیشن تھے۔ ایک کتاب اور دوسری کتاب میں جو فرق ہے وہ زبان اور اسٹائل کا ہے نہ کہ ناقص اور کامل کا۔

تاہم پیغمبر آخر الزماں کے بعد اب نجات کا ذریعہ صرف قرآن اور اسلام ہے۔ پچھلی کتابیں یا پچھلا مذہب اب کسی کے لئے نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے محفوظ اور غیر محفوظ کا فرق۔ قرآن اپنی اصل ابتدائی حالت میں مکمل طور پر محفوظ ہے۔ جب کہ اس سے پہلے کی دوسری کتابیں اپنی اصل حالت پر محفوظ نہیں۔ قرآن اور دوسری کتابوں کا یہ فرق تاریخی طور پر ثابت شدہ ہے۔ اس میں علمی طور پر کسی قسم کے شبہہ کی گنجائش نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ خدا کی کتاب کا جو اڈیشن محفوظ حالت میں موجود ہو وہی لوگوں کے لئے ہدایت اور نجات کا ذریعہ بنے گا نہ کہ وہ کتابیں جن میں انسانوں نے تحریف کر ڈالی ہے۔ جو اپنی اس اصل حالت پر محفوظ ہی نہیں جس پر خدا نے انھیں اتارا تھا۔

استقلال کی اہمیت

ایک بڑے تاجر کا قول ہے "کاروبار کو بار بار بدلنا کاروبار میں خود اپنے ہاتھ سے آگ لگانا ہے"۔ جب کوئی شخص اپنے کاروبار کو بدلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اپنی سابقہ تاریخ سے کاٹ دیتا ہے۔ پھر جو شخص خود ہی اپنی تاریخ سے اپنے آپ کو کاٹتا رہے اس کے پاس کیا چیز باقی رہے گی جو اس کا سرمایہ بن سکے۔

کاروبار ملازمت کی طرح نہیں کہ ایک مہینہ کام کیا تو پہلی تاریخ کو اس کی تنخواہ مل گئی۔ کاروبار ایک درخت کی مانند ہے جو سالوں کے بعد اپنے پھل دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ ایک درخت لگائے اور سال بھر کے بعد اس کو کاٹ کر دوسرا درخت لگائے اور اگلے سال تیسرا درخت۔ اسی طرح وہ پچیس سال تک کرتا رہے تو پچیس سال کی لمبی مدت گزارنے کے باوجود ایسا آدمی پھل دار درخت کا مالک نہ بن سکے گا۔ ایسے شخص کے لئے اس دنیا میں ہرا بھرا باغ مقدر نہیں۔

کسی شخص کے لئے پھل دار درخت حاصل کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ ایک درخت لگائے۔ اور اسی ایک درخت کو برابر بڑھاتا رہے۔ وہ ایک ہی درخت پر اپنی ساری توجہ لگا دے۔ اس کے بعد جب مدت پوری ہوگی تو اس کا درخت بڑھ کر ایک پورا پھل دار درخت بن جائے گا۔ اسی طرح کاروبار میں بھی آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر ایک کاروبار شروع کرے اور پھر پوری طرح اس میں لگ جائے۔ وہ کسی حال میں نہ اپنے کاروبار کو چھوڑے اور نہ اس کو بدلے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ ایک نہ ایک دن کامیاب ہو کر رہے گا۔ گوئٹے نے سچ کہا ہے "جس شخص کے اندر اٹل اور مستحکم ارادہ ہے وہ دنیا کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے"۔

آپ اپنے آس پاس کے لوگوں کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ کام کرنے والے تو بہت ہیں مگر کامیاب ہونے والے بہت کم۔ اس کی وجہ اکثر حالات میں عدم استقلال ہوتا ہے۔ جو لوگ استقلال کا ثبوت دیتے ہیں وہ کامیاب رہتے ہیں اور جو لوگ استقلال کا ثبوت نہیں دے پاتے وہ ناکام ہو جاتے ہیں۔ استقلال کا نہ ہونا کسی کو پیچھے ڈھکیل دیتا ہے اور استقلال کا ہونا کسی کو زندگی میں اعلیٰ درجات تک لے جاتا ہے۔

کسی مفکر نے سچ کہا ہے کہ "لوگوں میں طاقت کی اتنی کمی نہیں جتنی مستقل ارادے کی"۔ طاقت اور صلاحیت اکثر لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ اور سب لوگ اپنی طاقت اور صلاحیت کو استعمال

بھی کرتے ہیں۔ مگر بڑی کامیابی بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ بڑی کامیابی مستقل ارادہ مانگتی ہے۔ اور یہی وہ امتحان ہے جس میں اکثر لوگ ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ شروع کرنے کو تو ہر آدمی کوئی نہ کوئی کام شروع کر دیتا ہے۔ مگر اکثر لوگ زیادہ دیر تک اپنے کام کو جاری نہیں رکھ پاتے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو ان کو زندگی میں ناکام بنا دیتی ہے۔

ترقی اور خوش حالی مسلسل آگے بڑھتے رہنے کا دوسرا نام ہے۔ زندگی ایک ایسا مقابلہ ہے جس میں ٹھہرنا بھی گویا پیچھے ہٹنا ہے۔ اور جو شخص ایک بار پیچھے ہو گیا اس کو دوبارہ آگے بڑھنے کے لئے کئی گنا زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ آگے بڑھنا چلنا ہے۔ اور آگے نہ بڑھنا تھک کر بیٹھ جانا۔ رگ وید میں کہا گیا ہے کہ "قدم پیچھے نہ ہٹانے والا ہی خوش حالی کو فتح کرتا ہے"۔

اس دنیا میں نتیجہ ہمیشہ اس شخص کے حصے میں آتا ہے جو نتیجہ کی پروا کئے بغیر اپنا عمل برابر جاری رکھے۔ جس کی نظر ہر وقت نتیجہ پر ہو وہ بہت جلد مایوس ہو کر بیٹھ جائے گا۔ وہ استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتا۔ جس شخص کا یہ حال ہو کہ عمل ہی اس کے لئے لذت بن جائے۔ دیانت داری اور اخلاص کے ساتھ اپنے عمل میں لگا رہنا جس کو کافی نظر آئے وہ مستقل عمل پر قائم رہے گا۔ اور وہی حقیقی معنوں میں کامیاب ہوگا۔ یہی بات ہے جو مہابھارت کے ایک کردار کی زبان سے ان لفظوں میں ادا ہوئی ہے۔

"پھل کی خواہش کئے بغیر اپنا عمل کر"

برداشت کیجئے

شیلر نے کہا ہے "نفسانی خواہشات کا جنون تھوڑی دیر رہتا ہے مگر اس کا پچھتاوا بہت دیر تک"۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بڑی بڑی حماقتیں وقتی جذبہ کے تحت ہوتی ہیں۔ جب وقتی جذبہ ختم ہو جاتا ہے تو زندگی بھر آدمی افسوس کرتا رہتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اعتدال کی حالت میں آدمی خود ہی یہ مان لیتا ہے کہ بے اعتدالی کی حالت میں اس نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا۔

میری ملاقات ایک وکیل صاحب سے ہوئی۔ وہ فوج داری کے مقدمات کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اپنی قانونی پریکٹس کے دوران میرا تعلق بہت سے قاتلوں سے ہوا۔ میں نے پایا کہ ہر قاتل اپنے قاتلانہ فعل پر شرمندہ تھا۔ وکیل صاحب نے کہا کہ قتل ہمیشہ وقتی جذبہ کے تحت ہوتا ہے۔ وقتی جوش میں آکر ایک آدمی دوسرے آدمی کو مار ڈالتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کو ہوش آتا ہے تو ساری زندگی وہ پچھتاتا رہتا ہے۔ اس کا ضمیر ہمیشہ اس سے یہ کہتا ہے کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ قاتل کی بعد کی زندگی ایک ایسی سزا ہوتی ہے جو اس کے ضمیر کی عدالت نے خود اس کے اوپر

نافذ کیا ہو۔

جب بھی آپ پر اس قسم کا جذبہ سوار ہو تو فوری کارروائی سے رک جائیے۔ آپ کا رکنا ہی آپ کی اصلاح بن جائے گا۔ شام کے وقت اگر آپ پر جذبہ طاری ہو اور آپ کسی طرح اقدام سے بچ کر اپنے کو بستر پر پہنچا دیں تو اگلے دن جب آپ سو کر اٹھیں گے تو آپ کا جذبہ ٹھنڈا پڑ چکا ہو گا۔ آپ کو خود یہ سوچ کر تعجب ہو گا کہ کل آپ کا کیا حال ہو گیا تھا۔

انگریزی زبان میں ایک کہاوت ہے "انتقام کی پلیٹ ٹھنڈی کر کے کھا"، آپ کے سامنے کھانا آئے اور وہ زیادہ گرم ہو۔ ایسی حالت میں اگر آپ فوراً اس کو کھانے لگیں تو کیا ہو گا۔ خود آپ کا منھ جل جائے گا۔ ہر عقلمند آدمی ایسے گرم کھانے کو ٹھنڈا کر کے کھانا پسند کرے گا۔ یہی طریقہ ہم کو روزمرہ کی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انتقام کی آگ بجھا کر ہم کو لوگوں سے معاملہ کرنا ہے۔ اگر کسی کے اوپر آپ کو غصہ آجائے تو پہلے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیجئے۔ اس کے بعد سوچئے کہ آپ کو اپنے فریق کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے منفی ذہنیت کے ساتھ کوئی شخص نہ صحیح طور پر سوچ سکتا اور نہ صحیح طور پر یہ فیصلہ کر سکتا کہ اسے فی الحقیقت کیا کرنا چاہیئے۔

اسی بات کو شکسپیئر نے ان لفظوں میں کہا ہے "اپنے دشمن کے لئے اپنی بھٹی کو اتنا گرم نہ کر کہ وہ خود تجھ کو بھون ڈالے"۔ ظاہر ہے کہ جنون کی آگ سب سے پہلے آدمی کے اپنے اندر بھڑکتی ہے۔ اگر آدمی اپنے اندر تیز آگ بھڑکا لے تو دوسرے تک اس کا اثر بعد کو پہنچے گا۔ آدمی اس سے پہلے اپنے آپ کو جلا لے گا۔ پھر آپ ایسی حرکت کیوں کریں جس کا نقصان دوسرے تک پہنچنا مشتبہ ہو مگر خود اپنی ذات کو یقینی طور پر اس کا نقصان پہنچنے والا ہو۔ اگر آپ کو اپنے آپ سے محبت ہے تو یہی کافی ہے کہ آپ دوسرے سے نفرت کرنا چھوڑ دیں۔

اس دنیا میں اپنے آپ سے محبت کا راز بھی یہی ہے کہ آدمی دوسروں سے محبت کرے۔ جو شخص دوسروں سے نفرت میں مبتلا ہو جائے وہ خود اپنے لئے ہر طرف نفرت کے کانٹے بکھیرے گا۔ لوگوں کے درمیان خود اپنے لئے سکون کے ساتھ رہنے کو ناممکن بنا دے گا۔ نفرت پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھنا یہ ثابت کرنا ہے کہ آدمی معتدل حالت میں نہیں ہے۔ بائرن نے صحیح کہا ہے "نفرت دل کا پاگل پن ہے"، دماغی پاگل پن یہ ہے کہ آدمی ہوش کھو دے۔ دل کا پاگل پن یہ ہے کہ آدمی سنجیدگی اور اعتدال کھو دے ــــ کوئی شخص دماغی پاگل پن کو پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح دل کا پاگل پن بھی اس قابل ہے کہ آدمی اس سے دور رہے۔ (آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۲-۱۴ دسمبر ۱۹۸۳ء کو نشر کیا گیا)

آج بونا کل کاٹنا

گھنشیام داس برلا (۱۸۹۴-۱۹۸۳) راجستھان کے ایک گاؤں پلانی میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ ایک معمولی آدمی تھے اور کلکتہ میں جوٹ کے دلال کے طور پر کام کرتے تھے۔ چودہ سال کی عمر میں مسٹر برلا بھی کلکتہ چلے گئے اور وہاں اپنے باپ کے کام میں مدد کرنے لگے۔

مسٹر برلا کو ایک روز کلکتہ کے کسی تجارتی دفتر کی عمارت میں اوپر کی منزل پر جانا تھا۔ وہ جب لفٹ میں سوار ہونے لگے تو انھیں روک دیا گیا۔ کیوں کہ یہ لفٹ صرف انگریز افسروں کے استعمال کے لئے تھی۔ جب وہ سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچے تو وہاں بھی ان کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ان کو ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا جو چپراسیوں کے لئے مخصوص تھی۔ تاہم نوجوان برلا اس بنچ پر نہیں بیٹھے اور کام ہونے تک برابر کھڑے رہے۔

انگریزی دور میں مذکورہ بالا قسم کے تجربات نے مسٹر برلا کے اندر قومی آزادی کے خیالات پیدا کر دئے۔ وہ تحریک آزادی میں مہاتما گاندھی کے ساتھی بن گئے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سرمایہ دار طبقہ کانگرس کے قریب آنے سے گھبراتا تھا۔ مگر مسٹر برلا نہایت دور بین اور حوصلہ مند آدمی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کی کانگرس میں ۱۹۴۷ کے بعد کی کانگرس کی جھلک دیکھ لی۔ انھوں نے قومی تحریک کے دور کے ہندستان میں آزادی کے دور کے ہندستان کا مشاہدہ کر لیا۔ انھوں نے اس راز کو پا لیا کہ آج کے "لیڈر"، کل کے "وزیر" ہوں گے، آج اگر وہ ان لیڈروں کی مدد کریں تو کل وہ ان سے زبردست فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کی تحریک کی باقاعدہ مالی مدد شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ تک وہ اس سلسلے میں گاندھی جی کو اور کانگرس پارٹی کو تقریباً ۲۰ کروڑ روپے دے چکے تھے۔

آزادی کے بعد مسٹر برلا کو اس کا زبردست فائدہ حاصل ہوا۔ نئی حکومت کی طرف سے ان کو ہر قسم کی غیر معمولی سہولتیں ملنا شروع ہو گئیں۔ انھوں نے اتنی تیزی سے ترقی کی کہ آزاد ہندستان کے سب سے بڑے صنعت کار بن گئے۔ آج برلا کا خاندان ہندستان کا سب سے زیادہ دولتمند خاندان سمجھا جاتا ہے۔

جو آدمی آج بوتا ہے وہی آدمی کل کاٹتا ہے۔ یہ بات آج کی دنیا کے لئے بھی صحیح ہے اور یہی کل کی دنیا کے لئے بھی۔

قرآنی استدلال

سورہ الرعد (آیت ۱۰-۸) میں مادہ کے حمل سے خدا کے علم غیب اور فرشتوں کے وجود پر استدلال کیا گیا ہے جس کی تشریح حسب ذیل ہے۔

حاملہ کا پیٹ انسان کی پیدائش کا کارخانہ ہے۔ اس کارخانہ سے جو "پیداوار" بن کر نکلتی ہے وہ حیرت انگیز طور پر باہر کی ضروریات کے عین مطابق ہوتی ہے۔ چنانچہ باہر کی دنیا میں عورت اور مرد کی تعداد کے درمیان جو تناسب درکار ہے وہ ہزاروں برس سے مسلسل قائم ہے۔ دونوں صنفیں اتنی تعداد میں تیار کی جاتی ہیں کہ تقریباً ۵۰ فیصد مرد اور تقریباً ۵۰ فیصد عورت کا تناسب برقرار رہے۔ اسی طرح تمدن کا نظام چلانے کے لئے مختلف صلاحیتوں کے افراد درکار ہیں۔ مزدور اور ذہین، ادیب اور انجنیئر، لیڈر اور عوام۔ چنانچہ ماں کی فیکٹری ہر صلاحیت کے انسان اتنی تعداد میں تیار کر کے باہر بھیج رہی ہے کہ خارجی دنیا میں ان کا تناسب بگڑنے نہ پائے۔ اسی طرح پہچان کے لئے ضروری ہے کہ ہر آدمی کی صورت الگ الگ ہو۔ چنانچہ ہر مرد اور عورت الگ الگ صورت کے ساتھ پیدا کئے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیٹ کی فیکٹری کو مسلسل نئے نئے ماڈل فراہم کئے جا رہے ہیں اور ان کے مطابق وہ کروروں افراد اس طرح تیار کر رہی ہے کہ ہر ایک کا نقشہ دوسرے سے مختلف ہو۔

یہ ایک مشاہدہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کوئی ایسا ناظم ہے جس کی نظر بیک وقت پیٹ کے باہر بھی ہے اور پیٹ کے اندر بھی۔ وہ باہر کی دنیا کو دیکھ کر ضروریات کی تفصیل مرتب کرتا ہے اور پھر نہایت صحیح اندازہ کے مطابق پیٹ کے اندر پیداوار تیار کرا رہا ہے۔ دنیا میں اس قسم کا نظام ہونا یہ ثابت کرتا کہ اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔ اگر ایک ایسی ہستی یہاں موجود نہ ہو تو اندر اور باہر کے درمیان یہ توازن کبھی قائم نہیں ہو سکتا۔

کائنات میں غیر مرئی نگرانی کا نظام ثابت ہونے کے بعد یہ بات ناقابل فہم نہیں رہتی کہ یہ نظام دو سطح پر ہو۔ ایک خدا کی سطح پر دوسرے فرشتوں کی سطح پر جو خدا کے کارندے ہیں۔

یہ اصلاً صرف خدا کی صفت ہے کہ وہ حاضر اور غائب دونوں سے کامل طور پر واقف ہے۔ البتہ دنیا کے انتظام کے لئے اس نے کچھ درمیانی کارندے (فرشتے) بنائے ہیں۔ اور ان کو اپنی طرف سے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ مخفی طور پر آدمی کے آگے اور پیچھے رہیں۔ اور خدا کے حکم کے مطابق خدا کی طرف سے آدمی کی نگرانی کرتے رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں (نگرانی) کے نظام کو ماننے کے بعد فرشتوں کو ماننا اتنا ہی ممکن ہو جاتا ہے جتنا وائرلیس کی ٹکنالوجی کے ماننے کے بعد یہ ماننا کہ پڑوسی کے مکان میں ایک "واکی ٹاکی" موجود ہے۔

ذرہ برابر نیکی

عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال، یخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وفی قلبہ شعیرۃ من خیر ویخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وفی قلبہ وزن برۃ من خیر ویخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وفی قلبہ وزن ذرۃ من خیر (بخاری)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں جو کے برابر خیر ہو۔ اور آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں گیہوں کے برابر خیر ہو۔ اور آگ سے نکل آئے گا وہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ کے برابر خیر ہو۔

لا الہ الا اللہ کوئی لفظی منتر نہیں ہے جس کے مجرد تلفظ سے معجزاتی واقعات برآمد ہوتے ہوں۔ یہ اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف ہے کہ کائنات کی ساری طاقتیں صرف ایک خدا کے پاس ہیں، انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اسی ایک خدا سے تمام امیدیں وابستہ کرے اور اسی کو اپنا سب کچھ سمجھے۔

یہ سب سے بڑا واقعہ ہے۔ اس حقیقت واقعہ کا اعتراف جب آدمی کے دل ودماغ میں شامل ہوجاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ خدا کے سامنے جھک جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ بندوں کے ساتھ تعلقات میں اس کے اندر گھمنڈ اور سرکشی کا انداز ختم ہوجاتا ہے۔ خدا کے سامنے اس کا جھکنا بندوں کے معاملہ میں تواضع کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لا الہ الا اللہ کے اقرار کے نتیجہ میں پیدا شدہ اسی صالحیت کا نام خیر ہے۔ آدمی کا اقرار و اعتراف جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ بڑے پیمانہ پر اس کے اندر اس "خیر" کا ظہور ہوگا۔

انسانوں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جنہوں نے نہ تو خدا کے معاملہ میں حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کیا اور نہ ان کی زندگی میں خیر اور صالحیت کا ظہور ہوا۔ ایسے لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم ہوکر ابدی طور پر جہنم میں ڈال دئے جائیں گے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کے معاملہ میں پوری طرح حقیقت واقعہ کا اعتراف کیا اور اس اعتراف کے نتیجہ میں ان کی زندگی میں پوری طرح خیر کا ظہور ہوا۔ ایسے لوگوں

کے کم اچھے اعمال کو ان کے زیادہ اچھے اعمال کے تابع کر دیا جائے گا اور ان کا جو بہتر سے بہتر عمل ہوگا اس کے مطابق ان کو انعام دیا جائے گا۔ (نحل ، ۹) دوسرے لوگ وہ ہیں جنہوں نے خدا کے معاملہ میں حقیقت واقعہ کا اعتراف تو کیا مگر ان کا اعتراف اتنا گہرا نہ تھا جو ان کی عملی زندگی پر چھا جاتا۔

انہوں نے کچھ اچھے عمل کئے اور اسی کے ساتھ بہت سے برے عمل بھی ان سے سرزد ہوئے۔ ایسے لوگوں کے اچھے عمل میں اگر اللہ تعالیٰ واقعی "خیر" دیکھے گا تو امید ہے کہ ان کے برے اعمال کو ان کے اچھے اعمال کے تابع کر دے۔ وہ ان کے برے اعمال کو نظر انداز کر دے۔ اور ان کو وہ بدلہ دیدے جس کے وہ اپنے بعض اچھے اعمال کے اعتبار سے مستحق تھے (توبہ ۱۰۲)

اللہ کے معاملہ میں کسی شخص کے اندر خیر کا ذرہ پایا جانا یہ ہے کہ وہ چیز اس کے اندر کم مقدار میں پائی جا رہی ہو جس کی زیادہ مقدار کسی کو حقیقی معنوں میں صالح العمل بناتی ہے۔

وہ ذرہ یہ ہے کہ خدا کی عظمت کو سوچ کر کبھی اس کا دل تڑپ اٹھا ہو۔ خدا کی کبریائی کے تصور سے کبھی اس کے اوپر کپکپی طاری ہوئی ہو۔ اس پر کوئی ایسا لمحہ گزرا ہو جب کہ خدا کی بڑائی کے خیال نے اس سے اپنی بڑائی کے تمام احساسات چھین لئے ہوں۔ زندگی کے کسی موڑ پر اس نے اس ربانی کیفیت کا تجربہ کیا ہو جو خدا کو اپنا خدا بنا کر اور اپنے آپ کو عبد کا مقام دے کر آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے

اسی طرح بندوں کے معاملہ میں خیر کا ذرہ وہ ہے جس کو حدیث میں عمل کا آخری درجہ کہا گیا ہے۔ یعنی دوسروں کو اپنے شر سے محفوظ رکھنا۔ آدمی اگر دوسروں کو فائدہ نہ پہنچائے تو کم سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان اس طرح رہے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف یا نقصان نہ پہنچے۔ اگر آدمی نے دوسروں کو اپنے شر سے بچایا ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں خیر کا ذرہ شمار ہوگا اور وہ اس کو جہنم کی آگ سے بچانے کا ذریعہ بن جائے گا۔

اسلام کا تعارف

کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے۔ خدا نے ایک خاص سکیم کے تحت ہم کو پیدا کیا ہے جس کا علم وہ اپنے مخصوص اور منتخب بندوں کے ذریعہ ہم تک بھیجتا ہے جن کو ہم رسول کہتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے کے آخری رسول ہیں اور اب تمام دنیا کو آپ کی پیروی کرنی ہے۔ جو شخص آپ کی دعوت کو پاتے اور پھر اس کو قبول نہ کرے۔ وہ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتا بلکہ درحقیقت خدا کے تمام نبیوں کا انکار کر دیتا ہے۔ ایسا شخص خدا کا وفادار نہیں۔ بلکہ اس کا باغی ہے۔ اور خدا کی رحمتوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے ——— یہ ہے مختصر طور پر دین اسلام کا تعارف جس کی مجھے اس مضمون میں تشریح کرنی ہے۔

خدا کا وجود

سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ بعض لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سارا کارخانہ محض ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگیا ہے۔ اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔ ہکسلے کے الفاظ میں ——— چھ بندر ایک ایک ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جائیں۔ اور اربوں کھربوں سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحے پر شکسپیر کی ایک نظم نکل آئے۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال تک مادے کے اندھے عمل کے دوران میں بالکل اتفاق سے یہ دنیا بن گئی ہے۔

یہ جواب جس نے صدیوں سے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر رکھا ہے، یہ دراصل کوئی جواب نہیں ہے۔ بلکہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ اتفاق یا حادثہ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر جو چیز خود ہی اپنا وجود نہ رکھتی ہو وہ کسی دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب کس طرح بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی یہ تشریح کائنات کے اوپر بالکل چسپاں نہیں ہوتی۔ یہ محض ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ جو ذہنوں میں گھڑ لیا گیا ہے۔ اور کائنات کی حقیقی ساخت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس خدا کا تصور کائنات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ وہ خود کائنات کے اندر سے بول رہا ہے۔

کائنات اتنی پرحکمت اور اتنی منظم ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگئی ہو ۔ زمین پر جاندار چیزوں کی بقا کے لئے جو حالات ضروری ہیں وہ نہایت مکمل طور پر یہاں موجود ہیں۔ کیا محض اتفاق کے نتیجے میں اتنے عمدہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

کائنات میں نشانیاں

زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھومتی ہے۔ اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات اب کے دن اور رات سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری بہترین فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ میں جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں وہ لمبی رات میں پالے کی نذر ہو جاتیں۔

سورج جو ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے، اپنی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہائٹ سے دہک رہا ہے۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ یہ "کائناتی انگیٹھی" ہمیں ہماری ضرورت سے ذرہ بھر زیادہ گرمی نہ دے سکے۔ اگر سورج دگنے فاصلہ پر چلا جائے تو زمین پر اتنی سردی پیدا ہو گی کہ ہم سب لوگ جم کر برف ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ آدھے فاصلے پر آجائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہو گی کہ تمام جاندار اور تمام پودے جل بھن کر خاک ہو جائیں گے۔

زمین کا کرہ فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے بلکہ ۲۳ درجے کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف جھکا ہوا ہے یہ جھکاؤ ہمیں ہمارے موسم دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ آبادکاری کے قابل ہو جاتا ہے اور مختلف قسم کی نباتات اور پیداوار حاصل ہوتی ہیں۔ اگر یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کو چلے جاتے اور ہمارے براعظم برف سے ڈھکے رہتے۔

چاند ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ صرف پچاس ہزار میل دور ہوتا تو سمندروں میں مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرۂ ارض دن میں دو بار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے گھس کر ختم ہو جاتے۔

یہ ہماری کائنات کے چند نہایت معمولی اور بالکل سادہ واقعات ہیں۔ ان کے سوا بے شمار ایسے واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری زمین پر ان کا اجتماع محض اتفاقی طور پر نہیں

کہ جب بھی ہم اس کے کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو درحقیقت ہم اس کو محدود کر دیتے ہیں۔ کائنات کے ایک ایک جزء کے اندر اتنی حکمتیں ہیں کہ جب بھی ہم اس کی کسی حکمت کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم اس کو ایک کمتر درجے کی چیز بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ ایسی ایک کائنات کو خدا کی مخلوق ماننا اگر کسی کو خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خلاف عقل بات یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر لیا جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں تو خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر حال میں پیدا ہوتا ہے۔ خواہ ہم خدا کو مانیں یا نہ مانیں۔ ہم دو میں سے کسی ایک چیز کو بلا سبب ماننے پر مجبور ہیں۔ یا خدا کو بے سبب مانیں یا کائنات کو۔ ہمارے سامنے ایک عظیم کائنات ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں، جس کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ ہم مجبور ہیں کہ اس کائنات کے وجود کو تسلیم کریں۔ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ پھر ہم یا تو یہ کہیں کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی ہے یا یہ کہیں کہ کوئی اور ہستی ہے جس نے اس کو بنایا ہے۔ دونوں صورتوں میں ہم کسی نہ کسی کو بلا سبب تسلیم کریں گے۔ پھر کیوں نہ ہم خدا کو بلا سبب مان لیں جس کو ماننے کی صورت میں ہمارے تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ جبکہ کائنات کو بلا سبب ماننے کی شکل میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ تمام سوالات جو اس مسئلہ کے ارد گرد پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب بدستور باقی رہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے فلسفیانہ موشگافی کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ سب کچھ صرف ہمارا وہم ہے۔ مگر ایک شخص جب یہ بات کہتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ آخر یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا کہ کائنات کوئی چیز ہے یا نہیں۔ سوال کا پیدا ہونا خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی چیز ہے جس کے بارے میں سوال درپیش ہے۔ اور کوئی ہے جس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح فلسفۂ تشکیک بیک وقت انسان اور کائنات دونوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔

خدا کے ساتھ ہمارا تعلق

خدا کو ماننے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ پچاس سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے بھی تو اس سے ہمارا تعلق نہیں ہو سکتا۔ مگر جدید کوانٹم نظریہ کے ذریعہ خود سائنس نے اس کی تردید کر دی ہے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات

ایک مشین ہے جو ایک مرتبہ حرکت دینے کے بعد مسلسل چلی جارہی ہے۔ اس نظریہ پر سائنس دانوں کو اس قدر یقین تھا کہ انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک (Max Planck) نے جب روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے مشین ہونے کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو اس پر سخت تنقیدیں ہونے لگیں اور اس کا مذاق اڑایا گیا۔ مگر اس نظریئے کو زبردست کامیابی ہوئی اور بالآخر وہ ترقی کر کے نظریۂ مقادیر برقیات Quantum Theory کی صورت میں آج علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ [1]

پلانک کا نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں یہ تھا کہ قدرت چھلانگوں کے ذریعہ حرکت کرتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں آئن سٹائن نے اس بات کی وضاحت کی کہ پلانک کا نظریہ صرف عدم تسلسل Discontinuity کو ثابت نہیں کرتا بلکہ زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے۔ یہ اصولِ تعلیل کو اس کے بلند مقام سے معزول کر رہا ہے۔ جو اس سے پہلے عالم فطرت کے تمام واقعات کا واحد رہنما سمجھا جاتا تھا قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو سبب اور نتیجے کی مسلسل کڑیوں کے مطابق اس کے آغاز سے لے کر انجام تک معین ہو چکا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض ناقص مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ خدا کو اگر ماننا ہی ہے تو سبب اول کی حد تک اسے مان لو ورنہ آج کائنات کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کائنات صرف حرکت اول ہی کے لئے کسی محرک کی محتاج نہیں تھی بلکہ وہ ہر آن حرکت دیئے جانے کی محتاج ہے۔ کوانٹم نظریہ دوسرے لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ کائنات ایک خود چالو مشین نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی مشین ہے جس کو ہر آن چلایا جارہا ہے گویا ایک حیی وقیوم ہستی کا مسلسل فیضان ہے جو اس کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنا فیضان واپس لے لے تو ساری کائنات اس طرح ختم ہو جائے گی جیسے سینما گھر میں بجلی کا سلسلہ ٹوٹنے سے پردۂ سیمین کے سارے واقعات غائب ہو جاتے ہیں اور ناظرین کے سامنے ایک سفید کپڑے کے سوا اور کچھ نہیں رہتا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس دنیا کا ہر ذرہ اپنے وجود اور حرکت کے لئے ہر آن قادرِ مطلق سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

کائنات کے ساتھ خدا کا یہ تعلق خود بتاتا ہے کہ انسان کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہونا چاہیے۔

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحات ۱۲ — ۲۰

ظاہر ہے کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے، جو ہمارے لئے تمام موزوں ترین حالات کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے اور ان کو ہمارے حق میں ہموار کرتا رہتا ہے۔ جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے۔ اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ ہم اپنے مقابلے میں اس کی برتر حیثیت کو تسلیم کریں۔ اور بالکل اس کے بندے بن جائیں۔ انسان جن قدروں سے واقف ہے ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے۔ محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے وہ خود اس کے سامنے دب جاتا ہے، محسن کے آگے اس کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا خدا ہونا خود ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کی خدائی کو تسلیم کریں اور اس کی مرضی پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لئے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ یہ صرف حق شناسی کا تقاضا نہیں ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور اس کے مقابلے میں اپنی بندگی کو تسلیم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راہ بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں۔ ہم کو جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا۔ اس کے سوا کوئی اور ہمیں کچھ نہیں دے سکتا۔ ہم اس کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہیں کہ خدا کی مدد کے بغیر ایک لمحہ کے لئے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے۔ پھر خدا کو چھوڑ کر آخر ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے، یہ ہندوستان کی شمالی سرحد پر ہمالیہ پہاڑ کا ڈھائی ہزار میل لمبا سلسلہ کس نے قائم کیا ہے۔ ہم نے یا خدا نے۔ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی جنوب مشرقی ہوائیں جو ہر سال ہمارے لئے بارش لاتی ہیں۔ بالکل پانی نہ برسا تیں۔ وہ سیدھی روس کی طرف نکل جاتیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام شمالی ہندوستان منگولیا کی طرح ریگستان ہوتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورج اپنی غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو کھینچ رہا ہے، اور زمین ایک مرکز گریز قوت (Centrifugal Force) کے ذریعہ اس کی طرف کھنچ جانے سے اپنے آپ کو روکتی ہے۔ اس طرح وہ سورج سے دور رہ کر فضا کے اندر اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر کسی دن زمین کی یہ قوت ختم ہو جائے تو وہ تقریباً چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی، اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی جیسے کسی بہت بڑے

الاؤ کے اندر کوئی تنکا گر جائے۔ ظاہر ہے کہ زمین کو یہ طاقت ہم نے نہیں دی ہے بلکہ اس خدا نے دی ہے جس نے زمین کو پیدا کیا ہے۔

کائنات کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں اس کا نام نظام شمسی ہے، اگر آپ کسی دور دراز مقام پر بیٹھ کر اس نظام کا مشاہدہ کر سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ اتھاہ خلا کے اندر ایک آگ کا گولا بھڑک رہا ہے جو ہماری زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکلتے ہیں جو کئی کئی لاکھ میل تک فضا میں اڑتے چلے جاتے ہیں، اسی کا نام سورج ہے۔ پھر آپ ان سیاروں کو دیکھیں گے جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔ ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی دنیا ہے جس کی گولائی تقریباً پچیس ہزار میل ہے۔ یہ ہمارا نظام شمسی ہے جو بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کائنات کی وسعت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

کائنات میں اتنے بڑے بڑے ستارے ہیں جن کے اوپر ہمارا پورا نظام شمسی رکھا جا سکتا ہے۔ اس بے انتہا وسیع اور عظیم کائنات میں ہماری زمین فضا میں اڑنے والے ایک ذرے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کیڑے کی مانند اس ذرے سے چمٹے ہوئے ہیں اور خلا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مصروف ہیں۔

یہ کائنات کے اندر ہماری حیثیت ہے۔ غور کیجئے انسان کس درجہ حقیر ہے۔ وہ خارجی طاقتوں کے مقابلے میں کس قدر عاجز ہے۔ پھر جب ہماری حیثیت یہ ہے تو ہم خالق کائنات سے مدد طلب کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ جس طرح ایک چھوٹے بچے کی ساری کائنات اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی، اس کی ضرورتوں کی تکمیل اور اس کے مستقبل کا انحصار بالکل اس کے والدین کے اوپر ہوتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ انسان اپنے رب کا محتاج ہے۔ ہم خدا کی مدد اور اس کی رہنمائی کے بغیر اپنے لئے کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے۔ وہی ہمارا سہارا ہے اور اسی کی طرف ہمیں دوڑنا چاہیے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کی مدد کا محتاج ہے۔ خدا کے مقابلہ میں انسان کی یہی حیثیت قرار پاتی ہے اور خود انسان کے لئے بھی اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ خدا سے اپنے لئے مدد اور رہنمائی کی درخواست کرے۔ یہ حقیقت پسندی ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہہ انسان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

یہ حقیقت پسندی ہے اور حقیقت پسندی بلاشبہ انسان کی سب سے بڑی صفت ہے۔

یہاں پہنچ کر جب ہم اپنے گرد و پیش کی دنیا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لئے مدد اور رہنمائی کا ایک مستقل عمل جاری ہے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہے اس کو وہ چیز پہنچائی جا رہی ہے۔

ایک معمولی بھڑ (اینا) کی مثال لیجئے۔ بھڑ کا طریقہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے زمین میں ایک گڑھا کھود لیتی ہے اور ایک ٹڈے کو قابو میں کر کے اس کو گڑھے میں رکھ دیتی ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے اس خاص عصبی مقام پر ڈنک مارتی ہے جس سے ٹڈا مرتا نہیں صرف بے ہوش رہتا ہے اور تازہ گوشت کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔ بھڑ اب اس بے ہوش ٹڈے کے ارد گرد انڈے دیتی ہے تاکہ انڈوں سے نکل کر بچے اس زندہ ٹڈے کو دھیرے دھیرے کھاتے رہیں۔ کیونکہ مردہ گوشت ان بچوں کے لئے مہلک ہے۔ اتنا انتظام کر لینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑ جاتی ہے اور پھر کبھی اگر بچوں کو نہیں دیکھتی۔ مگر اس کے باوجود بھڑ کا یہ بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے ساری بھڑیں اس کام کو زندگی میں ایک بار اور پہلی بار بالکل ٹھیک ٹھیک انجام دیتی ہیں۔ غور کیجئے کہ وہ کون ہے جو اس بھڑ کے بچے کو سکھاتا ہے کہ اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لئے وہ بھی آئندہ وہی عمل کرے جو اس کے ساتھ اس کے ماں باپ نے کیا تھا۔ حالانکہ اپنے ماں باپ کے عمل کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔

اسی حیرت ناک عمل کو دیکھ کر فلسفی برگساں نے کہا تھا: کیا بھڑ نے کسی اسکول میں ماہرِ عضویات کی تعلیم حاصل کی ہے۔

اسی طرح ایک لمبی مچھلی کو لیجئے جسے انگریزی میں (Eal) کہتے ہیں۔ ڈنمارک کے ماہر حیوانات ڈاکٹر شمٹ (Johannes Schmidt) نے کئی سال کی تحقیق کے بعد معلوم کیا ہے کہ یہ عجیب و غریب جاندار اپنی زندگی کی جوانی میں ہر جگہ کے آبی مرکزوں اور ندیوں سے نکل نکل جزیرۂ برمودا کے پاس جمع ہوتے ہیں جہاں بحر اٹلانٹک سب سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ یورپ کی ایلین سمندر میں تین ہزار میل کا راستہ طے کر کے یہاں پہنچتی ہیں۔ وہیں یہ سب مچھلیاں بچے دیکر مر جاتی ہیں۔ یہ بچے جب آنکھ کھولتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی وہ وہاں سے لوٹ کر دوبارہ انھیں کناروں پر آ لگتے ہیں جہاں سے ان کے والدین چلے گئے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے ماں باپ

والی ندیوں، جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلیں ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہو جاتیں۔ اور یہ سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔ پھر آمد و رفت کی یہ معلومات انہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

یہ کام "وحی" کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وحی، پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان جاری ہے۔ کوئی مخلوق زندگی گذارنے کے لئے کیا کرے اور خالقِ کائنات نے اپنی مجموعی اسکیم کے اندر اس کے ذمے جو فرض عائد کیا ہے اس کو کس طرح انجام دے، اسی کو بتانے کا نام وحی ہے۔ اس وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات سے ہے، اور دوسری وہ جس کا تعلق انسان سے ہے۔

انسان کے سوا جتنی زندہ مخلوقات اس زمین پر پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہیں۔ ان کا کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور ارادے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے جس کو ہم جبلت (Instinct) کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک طرح کی زندہ مشینیں ہیں جو محدود دائرے میں اپنا متعین عمل کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے جانداروں کے لئے ترک واختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اس لئے ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں آتی بلکہ جبلت یا عادتِ فطری کی شکل میں آتی ہے۔ ان کی ساخت اس طرز کی بنا دی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو بار بار دہراتے رہیں۔ مگر انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے۔

وہ اپنے ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کو نہیں کرتا۔ وہ ایک کام کرنا شروع کرتا ہے، پھر اسے بالقصد چھوڑ دیتا ہے اور ایک کام کو نہیں کرتا اور بعد کو اسے کرنے لگتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگرچہ اسی طرح خدا کا بندہ ہے جس طرح اس کی دوسری مخلوقات، مگر اس کو حالتِ امتحان میں رکھا گیا ہے۔ جو کام دوسری مخلوقات سے عادتِ فطرت کے تحت لیا جا رہا ہے انسان کو وہی کام اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عام حیوانات کی وحی ان کی فطرت میں پیوست کر دی گئی ہے۔ اور انسان کی وحی خارج سے اسے سنائی جاتی ہے۔ عام حیوانات کو کیا کرنا ہے اس کا علم وہ پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں۔ اس کے برعکس انسان

جب عقل اور ہوش کی عمر کو پہنچتا ہے تو خدا کی طرف سے پکار کر اسے بتایا جاتا ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔

اس پیغام رسانی کا ذریعہ رسالت ہے۔ جو شخص یہ پیغام لے کر آتا ہے اس کو ہم رسول کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے ایک نیک بندے کو چن لیتا ہے اور اس کے قلب پر اپنا پیغام اتارتا ہے۔ اس طرح وہ شخص براہ راست خدا سے اس کی مرضی کا علم حاصل کرکے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ رسول گویا وہ درمیانی کڑی ہے جو بندے کو اس کے خدا سے جوڑتی ہے۔

وحی کا مسئلہ

اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ کسی بندۂ خاص پر خدا کی وحی کس طرح آتی ہے اور یہ کہ موجودہ زمانے میں وہ کون سی "وحی" ہے جس سے ہمیں خدا کی مرضی کا علم حاصل ہوگا۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے، انسان نے جو مشینیں اور جو آلات بنائے ہیں وہ تقریباً سب کے سب لوہے کے ہیں۔ اگر لوہے کی تاریخ سامنے رکھی جائے تو یہ بات نہایت عجیب معلوم ہوگی کہ انسان نے کس طرح اس کو دریافت کیا، جبکہ انسان کو لوہے کے متعلق پہلے سے کوئی علم نہیں تھا۔ اس نے کس طرح اس کے ذرات کو یکجا کیا جو مختلف مرکبات کی شکل میں زمین کی مختلف چٹانوں کے ساتھ مخلوط ہو کر منتشر پڑے تھے۔ اور پھر انہیں خالص لوہے کی ٹھوس شکل میں تبدیل کیا۔

یہی حال دوسری ایجادات کا بھی ہے۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ ان ایجادات کی طرف انسانی ذہن کی رہنمائی کس طرح ہوئی۔ وہ کون سی قوت ہے جو تجربہ اور مشاہدہ کے دوران ایک سائنس داں کو اس مخصوص نکتے تک پہنچا دیتی ہے جہاں پہنچ کر اسے ایک مفید اور کارآمد نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ جو بات ہم کو معلوم نہیں تھی وہ کیسے معلوم ہوگئی۔ اس علم کا ذریعہ وہی خدائی فیضان ہے جس کو ہم وحی کہتے ہیں۔ سب کچھ جاننے والا اپنے علم میں سے تھوڑا سا حصہ اس کو عطا کر دیتا ہے جو کچھ نہیں جانتا۔

یہ فیضان وحی کا ابتدائی درجہ ہے جو غیر محسوس طور پر آتا ہے اور ہر شخص کو اس میں سے حصہ ملتا ہے۔ وحی کی دوسری قسم زیادہ ترقی یافتہ ہے، جو شعوری طور پر آتی ہے اور صرف ان لوگوں کے پاس آتی ہے جن کو رسالت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہو۔ انسان کے پاس

حقیقت کا علم اور دنیا میں زندگی گذارنے کا طریقہ جو خدا کی طرف سے آیا ہے وہ اسی دوسری قسم کی وحی کے ذریعہ بھیجا جاتا ہے۔

وحی کی حقیقت کو ہم بس اسی قدر سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا دراصل ایک ایسا مطالبہ کرنا ہے جو انسان کے بس سے باہر ہے۔ ایک اڑتے ہوئے جہاز کو زمین سے لاسلکی پیغام بھیجا جاتا ہے جس کو ہوائی جہاز پر بیٹھا ہوا آدمی پورے یقین کے ساتھ صاف الفاظ میں سن لیتا ہے۔ یہ ہماری قریبی زندگی کا ایک واقعہ ہے۔ مگر آج تک اس کی مکمل توجیہ نہیں ہو سکی کہ یہ واقعہ کس طرح وجود میں آتا ہے۔ یہی حال ان تمام واقعات کا ہے جن سے ہم اس زمین پر واقف ہیں۔ ہم تمام حقیقتوں کو صرف مجمل طور پر جانتے ہیں۔ جیسے ہی ہم کسی حقیقت کو آخری حد تک سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ہماری قوتیں جواب دینے لگتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی کلی واقفیت ہمارے بس سے باہر ہے۔ ایسی صورت میں وحی کی حقیقت کو مکمل طور پر سمجھنے کا مطالبہ کرنا کسی ایسے ہی آدمی کا کام ہو سکتا ہے جو خود اپنی حقیقت سے بے خبر ہو۔

سائنس نے اب یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حقیقت مطلق کا علم حاصل کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ اس سلسلے میں میں پروفیسر ہائزن برگ (Heisen Berg) کی دریافت کا حوالہ دوں گا جس کو وہ اصول عدم تعین (Principle of Indeterminacy) کا نام دیتا ہے۔ جیمز جینز نے اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

" قدیم سائنس کا خیال تھا کہ کسی ذرے مثلاً ایک الکٹران کا مقام مکمل طور پر بتایا جا سکتا ہے جبکہ ہم یہ جان لیں کہ کسی خاص وقت میں فضا کے اندر اس کا مقام اور اس کی رفتار کیا ہے۔ اگر ان معلومات کے ساتھ بیرونی اثر انداز طاقتوں کا بھی علم ہو جائے تو الکٹران کے تمام مستقبل کو معین کیا جا سکتا تھا۔ اور اگر کائنات کے تمام ذروں کے متعلق ان باتوں کا علم ہو جاتا تو ساری کائنات کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔

مگر ہائزن برگ کی تشریح کے مطابق جدید سائنس اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ان مقدمات کی دریافت میں قوانینِ قدرت حائل ہیں۔ اگر ہم یہ جان لیں کہ ایک الکٹران فضا میں کس خاص مقام پر ہے جب بھی ہم ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ وہ کس رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ قدرت کسی حد تک گنجائشِ سہو (Margin of Error) کی اجازت دیتی ہے، لیکن اگر ہم اس گنجائش میں گھسنا چاہیں تو قدرت ہماری کوئی مدد نہیں کرتی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت بالکل صحیح پیمائشوں سے قطعاً ناآشنا ہے۔

اسی طرح اگر ہمیں کسی الکٹران کی حرکت کی ٹھیک ٹھیک رفتار معلوم ہو تو قدرت ہمیں فضا کے اندر اس کا صحیح مقام دریافت کرنے نہیں دیتی، گویا کہ الکٹران کا مقام اور اس کی حرکت کسی لالٹین کی سلائڈ کی دو مختلف سمتوں پر نقش ہیں۔ اگر ہم سلائڈ کو کسی خراب لالٹین میں رکھیں تو ہم دو رخوں کے درمیان نصف کو روشنی میں لا سکتے ہیں۔ اور الکٹران کے مقام اور اس کی حرکت دونوں کو کچھ نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ اچھی لالٹین کے ذریعہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہم ایک پر جتنی زیادہ روشنی ڈالیں گے، دوسرا اتنا ہی دھندلا ہوتا چلا جائے گا۔ خراب لالٹین، قدیم سائنس ہے جس نے ہمیں اس فریب میں مبتلا کر دیا کہ اگر ہمارے پاس بالکل مکمل لالٹین ہو تو ہم کسی خاص وقت پر ذرے کے مقام اور اس کی رفتار کا ٹھیک ٹھیک تعین کر سکتے ہیں۔ یہی دھوکہ تھا جس نے سائنس میں جبریت (Determinism) کو داخل کر دیا، مگر اب جبکہ جدید سائنس کے پاس زیادہ بہتر لالٹین ہے اس نے ہم کو صرف یہ بتایا ہے کہ حالت اور حرکت کی تعیین حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں جنھیں ہم بیک وقت روشنی میں نہیں لا سکتے (ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحہ ۱۷-۱۸)

اس سلسلہ میں آخری سوال یہ ہے کہ خدا کی وحی جو مختلف زمانوں میں انسانوں کے پاس آتی رہی ہے ان میں سے کون سی وحی ہے جس کی آج کے انسانوں کو پیروی کرنا ہے۔ اس کا جواب بالکل سادہ ہے۔ بعد کے لوگوں کے لئے وہی وحی قابل اتباع ہو سکتی ہے جو سب کے بعد آئی ہو۔ حکومت ایک ملک میں کسی شخص کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کی سفارت اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک وہ اس عہدے پر باقی ہو، جب اس کی مدت کارکردگی ختم ہو جائے اور دوسرے شخص کو اس عہدے پر مامور کر دیا جائے تو اس کے بعد وہی شخص حکومت کا نمائندہ ہوگا جس کو سب سے آخر میں نمائندگی کا موقع دیا گیا ہے۔

اس اعتبار سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ آخری رسول ہیں، جو آج اور آئندہ قیامت تک کے لئے انسانیت کے رہنما ہیں، جو ساتویں صدی عیسوی میں عرب سے اٹھے تھے۔ جن کے بعد نہ کوئی نبی ہوا اور نہ آئندہ کوئی نبی ہوگا۔ آپ کا تمام نبیوں کے بعد تشریف لانا اس بات کی کافی وجہ ہے کہ آپ ہی کو حال اور مستقبل کے لئے خدا کا نمائندہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ بعد کو آنے والا اپنے سے پہلے آنے والوں کو منسوخ کر سکتا ہے مگر پہلے آنے والا اپنے بعد آنے والے کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ ہم ان تمام نبیوں کو مانتے ہیں جو خدا کی طرف سے آئے، ان میں سے کسی کا بھی ہم انکار نہیں کرتے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے رسولوں میں تفریق نہ کرو۔ (بقرہ — آخر) مگر یہ ظاہر ہے کہ اطاعت

اور پیروی صرف وقت کے نبی ہی کی ممکن ہے اور اسی کی ہونی چاہیئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کا نہ آنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ہی وقت کے نبی ہیں۔ اور اب تمام انسانوں کو آپ ہی کی پیروی کرنی ہے۔ جب کوئی نبی آتا ہے تو وہ دراصل اپنے وقت کے لئے خدا کا حکم ہوتا ہے۔ وقت کے نبی کو چھوڑ کر اس سے پہلے کے کسی نبی کی اطاعت کا دعوٰی کرنا خدا پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے۔ ایسا شخص خدا کے یہاں اس کے وفاداروں میں شمار نہیں ہوگا بلکہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے گا اور خود تاریخ کے وہ رسول اس سے برأت کریں گے جن کی پیروی کا آج وہ دعوٰی کر رہا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے پرانی اور ابتدائی مذہبی کتاب رگ وید ہو جو خدا کی ہدایت کے تحت مرتب کی گئی ہو جیسا کہ انجیل نسبتاً درمیانی زمانے کی الہامی کتاب ہے۔ مگر اب یہ تمام کتابیں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے مضامین کی صحت مشکوک ہے۔ اور اس سے قطع نظر کہ ان میں سے کوئی کتاب بھی اپنے کو آخری اور دائمی کتاب کی حیثیت سے پیش نہیں کرتی، صرف یہ واقعہ کہ وہ خدا کے آخری ہدایت نامے سے پہلے نازل کی گئی تھیں، ان کو آج کے لئے منسوخ قرار دے دیتا ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ہم حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا رسول ہی کیوں تسلیم کریں، میرا جواب یہ ہے کہ جن وجوہ سے آپ دوسرے رسولوں کو رسول مانتے ہیں انھیں وجوہ سے آخری رسول کو بھی رسول ماننا پڑیگا۔ آپ کسی دوسرے رسول کے بارہ میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ خدا کی طرف سے آئے تھے، جو بھی اصول بنائیں گے اور جو مقدمات قائم کریں گے، ٹھیک ٹھیک انھیں دلائل اور انھیں مقدمات کی بنا پر آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی خدا کا رسول ماننا ہوگا۔ اگر آپ آخری رسول کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو سارے رسولوں کا انکار کر دینا پڑے گا۔ اور اگر دوسرے رسولوں کو مانتے ہیں تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آخری رسول کو بھی تسلیم کریں اور جوں ہی آپ آخری رسول کو تسلیم کرتے ہیں، آپ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ اسی کو آخری سند قرار دیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننا اور آپ کو آخری سند تسلیم نہ کرنا دونوں بالکل متضاد چیزیں ہیں، جو ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ خدا کے آخری حکم کی موجودگی میں اس کے سابقہ حکموں کا حوالہ دینا خدا کی اطاعت کا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے خدا کبھی راضی نہیں ہوسکتا یہ خود اپنے نفس کی اطاعت ہے نہ کہ خدا کی اطاعت۔

THE INTRODUCTION TO ISLAM SERIES

The INTRODUCTION TO ISLAM SERIES is the rendering into English of the Urdu Ta'arufi Set by Maulana Wahiduddin Khan. It provides the general public with an understanding of the basic teachings of divinely revealed religion.

The titles in this series:

1. **The Way to Find God**
2. **The Teachings of Islam**
3. **The Good Life**
4. **The Garden of Paradise**
5. **The Fire of Hell**

Maktaba Al-Risala

Jamiat Building, Qasimjan Street, Delhi 110 006

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسکول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا